سورۂ یونس

آیاتہا ۱۰۹ ﴿۱۰ سُوْرَۃُ یُوْنُسَ مَکِّیَّۃٌ ۵۱﴾ رکوعاتہا ۱۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

حضرت حسن، عکرمہ، عطا اور جابر رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق سورۂ یونس علیہ السلام مکی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: سوائے تین آیات کے جو قول باری تعالیٰ: اِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ سے شروع ہو کر تین آیتوں کے آخر تک ہیں۔ اور مقاتل نے کہا ہے: سوائے دو آیتوں کے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ یہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ سورت مکیہ ہے سوائے اس ارشاد کے: وَ مِنْهُمْ مَّنْ یُّؤْمِنُ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّا یُؤْمِنُ بِهٖ یہ آیت یہود کے بارے میں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: اس کے اول سے تقریباً چالیس آیتیں مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں اور اس کی بقیہ آیات مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں (1)۔

الٓرٰ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ ①

"الف، لام، را، یہ آیتیں ہیں کتاب حکیم کی"۔

قولہ تعالیٰ: الٓرٰ نحاس نے کہا ہے: اسے ابو جعفر احمد بن شعیب بن علی ابن حسین بن حریث پر پڑھا گیا تو انہوں نے کہا: ہمیں علی بن حسین نے اپنے باپ سے اور انہوں نے یزید سے یہ خبر دی ہے کہ عکرمہ نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے: الٓرٰ، حٰمٓ اور نٓ یہ الرحمن کے حروف ہیں جو الگ الگ بیان کیے گئے ہیں۔ تو میں نے اس کا ذکر اعمش سے کیا تو انہوں نے کہا: تیرے پاس اس کی مثل (اور) بھی ہیں اور تو مجھے اس کے بارے خبر نہ دے؟ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے کہا: الٓرٰ کا معنی ہے أنا اللہ أری (2) (میں اللہ ہوں دیکھ رہا ہوں) نحاس نے کہا ہے: میں نے ابو اسحاق کو دیکھا کہ وہ اس قول کی طرف مائل ہیں، کیونکہ سیبویہ نے عربوں سے اس کی مثل بیان کیا ہے اور شعر بھی بیان کیا ہے:

بالخیر خیرات وإن شرا فا　　ولا أرید الشر إلا أن تا

اور حسن اور عکرمہ نے کہا ہے: الٓرٰ قسم ہے۔ اور سعید نے حضرت قتادہ سے بیان کیا ہے: الٓرٰ سورت کا نام ہے۔ مزید کہا: قرآن کریم میں تمام حروف تہجی اسی طرح ہیں۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ سورتوں کے فواتح اور آغاز ہیں۔ اور محمد بن یزید نے کہا ہے: یہ حروف تنبیہ ہیں اور اسی طرح تمام حروف تہجی ہیں۔ اور الٓرٰ کو بغیر امالہ کے پڑھا گیا ہے۔ اور امالہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے تاکہ یہ حروف میں سے ما اور لہ کے مشابہ نہ ہو جائیں۔

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 102　　2۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 93

قولہ تعالیٰ: تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ یہ مبتدا اور خبر ہے، یعنی یہ جن کا ذکر جاری ہے کتاب حکیم کی آیات ہیں۔ حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: کتاب سے مراد تورات، انجیل اور سابقہ کتب ہیں (1)، کیونکہ تِلْكَ مونث غائب کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تِلْكَ بمعنی ھذہ ہے، یعنی ھذہ آیات الکتاب الحکیم (یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں) اور اسی سے اعشیٰ کا قول ہے:

تلك خَيْلِي منه وتلك رِكَابِي   هُنَّ صُفْرٌ أولادها كالزَّبيب

مراد ھذہ خیلی ہے (2)۔ اور الْكِتٰبِ سے مراد قرآن کریم ہے اور یہی صواب کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ سابقہ کتابوں کا ذکر جاری نہیں ہے۔ اور اس لیے بھی کہ الْحَكِيْمِ قرآن کی صفت ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (ہود: 1)

یہ معنی سورۃ البقرہ کے اوّل میں ہو چکا ہے۔ اور الحکیم: جس کے ساتھ حلال وحرام، حدود اور احکام کے بارے فیصلہ کیا جائے۔ یہ ابو عبیدہ وغیرہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: حکیم بمعنی حاکم ہے، یعنی بے شک یہ حلال وحرام کے بارے فیصلہ کرنے والا ہے اور لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرنے والا ہے۔ یہ فعیل بمعنی فاعل ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (البقرہ: 213) (اور نازل فرمائی ان کے ساتھ کتاب برحق تاکہ فیصلہ کر دے لوگوں کے درمیان جن باتوں میں وہ جھگڑنے لگے تھے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حکیم بمعنی محکوم فیہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس میں عدل و احسان کرنے اور ذوالقربیٰ کو دینے کے بارے میں فیصلہ فرمایا اور اس میں فحشاء اور منکر سے نہی کے بارے فیصلہ کیا اور اس کے بارے جنت کا فیصلہ کیا جس نے اطاعت کی اور اس کے بارے جہنم کا فیصلہ کیا جس نے نافرمانی کی، تو یہ فعیل بمعنی مفعول ہے۔ یہ حسن وغیرہ نے کہا ہے۔ اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حکیم بمعنی محکم من الباطل (جو باطل سے محفوظ ہو) ہے اس میں نہ کذب ہے اور نہ اختلاف۔ یہ فعیل بمعنی مفعل ہے، جیسے اعشیٰ کا قول ہے وہ اپنا وہ قصیدہ بیان کرتا ہے جو اس نے کہا ہے:

و غريبة تأتي الملوك حكيمة   قد قلتها ليقال من ذا قالها

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؔ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝

''کیا (یہ بات) لوگوں کے لیے باعث تعجب ہے کہ ہم نے وحی بھیجی ایک مرد (کامل) پر جو ان میں سے ہے کہ ڈراؤ لوگوں کو اور خوشخبری دو انہیں جو ایمان لائے کہ ان کے لیے مرتبہ بلند ہے ان کے رب کے ہاں، کفار نے کہا بلاشبہ یہ جادوگر ہے کھلا ہوا''۔

قولہ تعالیٰ: اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا یہ استفہام برائے تقریر و توبیخ ہے۔ اور عَجَبًا، کان کی خبر ہے اور اس کا اسم اَنْ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 102   2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 420

اَوْحَيْنَآ ہے اور یہ محل رفع میں ہے: ای کان ایحاؤنا عجبا للناس (یعنی کیا ہمارا وحی کرنا لوگوں کے لیے باعث تعجب ہے) اور حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت میں عجب ہے اس بنا پر یہ کان کا اسم ہوگا۔ اور خبر اَنْ اَوْحَيْنَآ ہوگی۔ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اس کو رجل جیم کے سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اور اس کے سبب نزول کے بارے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کفار نے اس وقت کہا جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا: بے شک اللہ تعالیٰ اس سے عظیم تر ہے کہ اس کا رسول کوئی بشر ہو(1)۔ اور انہوں نے کہا: ابو طالب کے یتیم کے سوا اللہ تعالیٰ نے کوئی نہیں پایا جسے وہ رسول بنا کر بھیجے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا یعنی کیا اہل مکہ کو تعجب ہوا؟ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں بعث (بعد الموت) کے ذکر سے تعجب ہوا۔

قولہ تعالیٰ: اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا یہ حرف جار کے اسقاط کے سبب محل نصب میں ہے ای بأن انذر الناس اور اسی طرح اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ بھی ہے اور نذارت بشارت اور آیت کے دوسرے الفاظ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور قَدَمَ صِدْقٍ کے معنی میں اختلاف ہے۔ پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قَدَمَ صِدْقٍ سے مراد منزل صدق (صدق کی منزل، مرتبہ) ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِىْ مُدْخَلَ صِدْقٍ (الاسراء:80)

اور آپ سے یہ بھی مروی ہے: اس سے مراد ان اعمال کا اجر حسن ہے جو انہوں نے آگے بھیجے۔ اور یہ بھی مروی ہے: قَدَمَ صِدْقٍ کا معنی ذکر اول میں سعادت کا سبقت لے جانا ہے۔ اور یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی بلند مرتبہ ہے۔ ذوالرمہ نے کہا ہے:

لکم قدم لا ینکر الناس أنها مع الحسب العالی طمّت علی البحر

اس میں قدم بلند مرتبہ کے معنی میں ہی ہے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی سلف صدق (صحیح کامل) ہے(2)، ربیع نے کہا ہے: اس کا معنی ثواب صدق (سچ کا ثواب) ہے۔ عطا نے کہا ہے: مراد مقام صدق ہے۔ یمان نے کہا ہے: مراد ایمان صدق ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد ملائکہ کی دعوت ہے (فرشتوں کا دعا کرنا ہے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ صالح بچہ ہے جسے وہ آگے بھیجیں۔ ماوردی نے کہا ہے تا کہ صدق طاعت، صدق جزا کے موافق ہو جائے (3)۔ اور حضرت حسن اور قتادہ نے بھی کہا ہے: وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیونکہ آپ شفاعت فرمانے والے ہیں جن کی اطاعت کی گئی ہے آپ ان سے آگے ہوں گے، جیسا کہ آپ نے فرمایا: أنا فرطكم على الحوض (4) (میں تم سے پہلے حوض پر موجود ہوں گا) تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ھی شفاعتی توسلون بی الی ربکم (یہ میری شفاعت ہے تم مجھے اپنے رب کی بارگاہ میں بطور وسیلہ پیش کرو گے) اور ترمذی الحکیم نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام محمود پر مقدم کرے گا۔ اور حسن سے بھی مروی ہے: مراد حضور

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 421
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 422
4۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 127

نبی مکرم ﷺ کے بارے میں ان کا مصیبت اور تکلیف میں پڑنا ہے۔ اور عبدالعزیز بن یحییٰ نے کہا ہے: قَدَمَ صِدْقٍ سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓىِٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ (الانبیاء) (بلاشبہ وہ لوگ جن کے لیے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے) اور مقاتل نے کہا ہے: مراد وہ اعمال ہیں جنہیں انہوں نے آگے بھیجا۔ اس کو علامہ طبری نے اختیار کیا ہے۔ الوضاح نے کہا ہے:

صلّ لذی العرش واتخذ قَدَمًا　　تُنجیك یوم العِثار والزَّلَل

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا اس امت کو قبروں سے اٹھائے جانے میں اور جنت میں داخل کرنے میں مقدم کرنا ہے، جیسا کہ فرمایا: نحن الآخرون السابقون یوم القیامة المقضی لهم قبل الخلائق (1) (ہم بعد میں آنے والے قیامت کے دن سبقت لے جانے والے ہیں ان کے لیے مخلوقات سے پہلے اس کا فیصلہ کر دیا گیا ہے) اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ عمل صالح میں سعی کرنے سے کنایہ ہے۔ پس اس کو بطور کنایہ قدم سے ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ انعام کا ذکر بطور کنایہ ید (ہاتھ) سے کیا جاتا ہے اور ثنا (تعریف) کو بطور کنایہ لسان (زبان) سے ذکر کیا جاتا ہے۔ اور حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے:

لنا القَدَم العلیا إلیك وخَلفُنا　　لأولنا فی طاعة الله تابع

ہمارے لیے تیری طرف عمل صالح کی کوشش کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے میں ہمارے پیچھے آنے والے پہلوں کے تابع ہیں۔

وہ السابقة سے مراد اخلاص فی الطاعة لیتے ہیں (2)۔ واللہ اعلم۔ اور ابو عبید اور کسائی نے کہا ہے: خیر یا شر میں سے ہر سبقت لے جانے والا اعربوں کے نزدیک قدم ہے: کہا جاتا ہے: لفلان قدم فی الإسلام (فلاں اسلام میں سبقت لے جانا والا ہے) له عندی قدم صدق و قدم شر، و قدم خیر (اس کی میرے نزدیک سچ میں سبقت ہے اور شر میں سبقت ہے اور خیر میں سبقت ہے)

یہ لفظ مونث ہے اور کبھی مذکر ذکر کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: قدم حسن اور قدم صالحة۔ اور ابن الاعرابی نے کہا ہے: القدم سے مراد شرف میں آگے بڑھنا ہے۔ عجاج نے کہا ہے:

زلّ بنو العوّام عن آل الحَکَم　　وترکوا المُلك لملك ذی قَدَم

اور صحاح میں ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''میرے پانچ اسماء ہیں: میں محمد اور احمد (ﷺ) ہوں، میں وہ ماحی ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ کفر کو مٹا دے گا اور میں وہ حاشر ہوں کہ لوگوں کو میرے قدموں پر اٹھایا جائے گا اور میں عاقب ہوں'' (3)۔ اس سے مراد آخر الانبیاء (تمام انبیاء سے آخر میں آنے والا) ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، جلد 2، صفحہ 1116
2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 422
3۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، جلد 1، صفحہ 500-501

خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (الاحزاب:40)

قولہ تعالیٰ: قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیْنٌ ابن محیصن، ابن کثیر، کوفیوں، عاصم، حمزہ، کسائی، خلف اور اعمش رحمۃ اللہ علیہم ان تمام نے لساحر پڑھا ہے اس لیے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے اور باقیوں نے لسحر پڑھا ہے اس لیے کہ یہ قرآن کی صفت ہے۔ سحر کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳

"بے شک تمہارا رب اللہ تعالیٰ ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پھر متمکن ہوا عرش پر (جیسے اسے زیبا ہے) ہر کام کی تدبیر فرماتا ہے، کوئی نہیں شفاعت کرنے والا مگر اس کی اجازت کے بعد۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ جو تمہارا پروردگار ہے سو عبادت کرو اس کی، تو کیا تم غور وفکر نہیں کرتے"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ اس کی تفسیر سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ اکیلے ہر کام کا فیصلہ کرتا ہے اور اس کو مقرر کرتا ہے (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اپنی خلق کی تدبیر میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ امر کے ساتھ بھیجتا ہے۔ یہ قول بھی ہے وہ امر کے سات نازل کرتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ہر کام کے بارے حکم دیتا ہے اور اسے کرگزرتا ہے۔ یہ تمام معانی باہم متقارب ہیں۔ پس حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی کے لیے اور حضرت میکائیل علیہ السلام بارش کے لیے، حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکنے کے لیے اور حضرت عزرائیل علیہ السلام (روح) قبض کرنے کے لیے مقرر ہیں۔ اور یُدَبِّرُ الْاَمْرَ کا حقیقی معنی امور کو ان کے انجام کے احکام کی بنا پر ان کے مراتب پر رکھنا ہے۔ اور یہ الدبر سے مشتق ہے اور الامر جنس امور کا اسم ہے۔ مَا مِنْ شَفِیْعٍ یہ محل رفع میں ہے اس کا معنی ما شفیع (کوئی شفاعت کرنے والا نہیں) ہے۔

اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ شفاعت کا معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ فلا یشفع أحد نبی ولا غیرہ إلا باذنہ سبحانہ (پس کوئی نبی شفاعت نہیں کر سکے گا اور نہ کوئی اور مگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اجازت کے ساتھ) یہ کفار کے اس قول کا رد ہے جو انہوں نے ان کے بارے کہا جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کرتے تھے: هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس:18) (یہ اللہ کے پاس ہماری شفاعت کرنے والے ہوں گے) پس اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ فرمادیا کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی کسی کی شفاعت نہیں کر سکے گا پس بتوں کی شفاعت کیسے ممکن ہو سکتی ہے جو عقل ہی نہیں رکھتے؟

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ یعنی یہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں سے یہ کام کیے ہیں یہی

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 104

تمہارا رب ہے اس کے سوا تمہارا کوئی رب نہیں۔ فَاعْبُدُوْهُ پس تم اسے وحدہ لاشریک مانو اور اسی کے لیے عبادت کو خالص کرو۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ تو کیا تم غور و فکر نہیں کرتے کہ یہ اس کی مخلوقات ہیں پس تم ان سے اس کی ذات پر استدلال کرو۔

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ۖ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۚ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ④

"اسی کی طرف لوٹنا ہے تم سب نے، یہ الله تعالیٰ کا سچا وعدہ ہے۔ بے شک وہی ابتدا کرتا ہے پیدائش کی پھر وہی دہرائے گا اسے تاکہ جزا دے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے انصاف کے ساتھ اور جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے پینے کو کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہوگا بوجہ اس کے کہ وہ کفر کرتے رہتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ یہ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے۔ جَمِيْعًا یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور رجوع الی الله کا معنی اس کی جزا کی طرف لوٹنا ہے۔ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا یہ دونوں مصدر ہیں، یعنی وعد الله ذالك وعدا و حققه، حَقًّا، صدقا لاخلف فيه یعنی الله تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرما رکھا ہے اور اس نے اسے سچ ثابت کیا ہے اس میں اس کا خلاف قطعاً نہیں۔ اور ابراہیم بن ابی عبلہ نے وَعْدُ اللّٰهِ حَقٌّ پڑھا ہے اور اسے استیناف پر محمول کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ بے شک وہی مٹی سے پیدائش کی ابتدا کرتا ہے۔ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے گا۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہی اسے پیدا کرتا ہے پھر وہی اسے مارتا ہے اور پھر دوبارہ اٹھانے کے لیے اسے زندہ کرے گا(1) یا بے شک وہی اسے پانی سے پیدا کرتا ہے پھر اسے ایک حال سے دوسرے حال کی طرف لوٹاتا ہے۔

یزید بن قعقاع نے أنه يبدأ الخلق پڑھا ہے اس میں ان محل نصب میں ہوگا۔ ای وعدکم أنه يبدأ الخلق (اس نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ وہی پیدائش کی ابتدا کرے گا) اور یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہو لأنه يبدأ الخلق (کیونکہ وہی پیدائش کی ابتداء کرتا ہے)۔ جیسے کہا جاتا ہے: لَبَّيْكَ أنّ الحمد والنعمة لك اور اس میں کسرہ عمدہ ہے اور فراء نے جائز قرار دیا ہے کہ ان محل رفع میں ہو اور وہ اسم ہو۔ احمد بن یحییٰ نے کہا ہے: تقدیر کلام یہ ہوگی حقا ابداؤه الخلق اس کی پیدائش کی ابتداء کرنا حق ہے۔

قولہ تعالیٰ: لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ تاکہ وہ انہیں عدل کے ساتھ جزا دے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ یعنی کافروں کے لیے ایسا گرم پانی ہوگا جس کی گرمی اپنی انتہاء کو پہنچی ہوگی، الحميمة بھی اسی کی مثل ہے۔ کہا جاتا ہے: حَمَمْتُ الماء أحُمّه فهو حميم، ای محموم۔ یہ فعیل بمعنی مفعول ہے (سخت گرم کیا ہوا) اور عربوں کے نزدیک ہر گرم کی ہوئی شی حمیم کہلاتی ہے۔ وَعَذَابٌ اَلِيْمٌ یعنی دردناک عذاب، اس کا درد اور تکلیف ان کے دلوں تک پہنچے گی۔ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ یعنی ان کے کفر کے سبب (یہ عذاب ہوگا) بڑے بڑے قریش یہ

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 99

اعتراف کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے۔ پس ان کے خلاف اس سے استدلال کیا ہے اور فرمایا ہے: جو ابتداء پر قادر ہے وہ فناہ کرنے کے بعد یا اجزاء کو متفرق کرنے کے بعد دوبارہ اٹھانے پر بھی قادر ہے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَّالْقَمَرَ نُورًا وَّقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٥﴾

''وہی ہے جس نے بنایا سورج کو درخشاں اور چاند کو نور اور مقرر کیں اس کے لیے منزلیں تاکہ تم جان لو گنتی برسوں کی اور حساب، نہیں پیدا فرمایا اللہ تعالیٰ نے اسے مگر حق کے ساتھ، تفصیل سے بیان کرتا ہے (اپنی قدرت کی) نشانیاں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً یہ دونوں (الشمس اور ضیاء) مفعول ہیں، ضیاء بمعنی مضیۃ (روشن کرنے والا) اور اسے مونث ذکر نہیں کیا کیونکہ یہ مصدر ہے، یا پھر یہ بمعنی ذات ضیاء ہے (روشنی والا) وَّالْقَمَرَ نُورًا یہ ماقبل پر معطوف ہے۔ یہ بھی نور بمعنی منیرا یا ذانور ہے (نور والا) پس ضیاء سے مراد وہ روشنی ہے جو چیزوں کو روشن کر دیتی ہے۔ اور نور وہ ہے جو ظاہر ہوتا ہے اور چھپ جاتا ہے، کیونکہ یہ ایک ہی اصل نار سے ہے۔ اور ضیاء ضوء کی جمع ہے، جیسا سیاط سوط (کوڑا) کی جمع ہے اور حیاض حوض کی جمع ہے۔ قنبل نے ابن کثیر سے ضئاء یا کو ہمزہ سے بدل کر پڑھا ہے اور اس کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیونکہ اس کی یاء، واؤ مفتوحہ تھی اور یہ فعل کا عین کلمہ ہے، اس کی اصل ضواء ہے پھر اس میں قلب کیا گیا اور اسے یاء بنا دیا گیا جیسا کہ صیام اور قیام میں کیا گیا ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: جس نے ضئاء ہمزہ کے ساتھ پڑھا تو وہ قلب کیا گیا ہے، الف کے بعد والے ہمزہ کو مقدم کیا گیا تو وہ الف سے پہلے آ گیا اور ضایا ہو گیا، پھر یا کو ہمزہ سے بدل دیا گیا کیونکہ وہ الف زائدہ کے بعد واقع ہے۔ اسی طرح اگر تو مقدر مان لے کہ یاء جس وقت مؤخر ہو تو وہ اس واؤ کی طرف لوٹ جائے گی جس سے وہ بدلی تھی۔ اور پھر وہ بھی ہمزہ سے بدل جائے گی پس اس کا وزن فلاع ہے جو فعال سے مقلوب ہے۔ اور کہا جاتا ہے: بے شک سورج اور چاند ان دونوں کے چہرے سات آسمانوں کے باسیوں کو اور ان کی پشتیں سات زمینوں کے رہنے والوں کو روشن کرتی ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَّقَدَّرَهُ مَنَازِلَ یعنی اس کو منزلوں والا بنایا یا اس کی منزلیں مقرر کیں۔ پھر کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وقدرھما (یعنی دونوں کے لیے منزلیں مقرر کیں) لیکن ایجاز و اختصار کے لیے ضمیر واحد ذکر کی، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا (الجمعۃ: 11) (اور (بعض لوگوں نے) جب دیکھا کسی تجارت یا تماشا کو تو بکھر گئے اس کی طرف) اور جیسا کہ کسی شاعر نے کہا:

نحن بما عندنا وأنت بما عندك راضٍ والرأي مختلِفُ

ہم اس کے ساتھ راضی ہیں جو ہمارے پاس ہے اور تو اس کے ساتھ راضی ہے جو تیرے پاس ہے اور رائے مختلف ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ اکیلے چاند کے بارے میں خبر ہو، کیونکہ اسی کے ساتھ ان مہینوں کو شمار کیا جاتا ہے جن پر معاملات وغیرہ میں عمل ہوتا ہے، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور سورۂ یاسین میں ہے: وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ

(یٰسین:39) یعنی مہینے کے عدد پر اس کی منزلیں مقرر کیں اور وہ اٹھائیس منزلیں ہیں۔ اور دو دن (اس کے) نقصان (کم ہونے) اور محاق (دکھائی نہ دینے) کے لیے ہیں۔ اس کا تفصیلی بیان وہاں آئے گا۔

قولہ تعالیٰ: لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ دو سورج بناتا ایک سورج دن کے لیے اور ایک سورج رات کے لیے تو ان دونوں میں نہ تاریکی ہوتی اور نہ رات، نہ سالوں کی گنتی اور مہینوں کا حساب معلوم ہوتا۔ اور السِّنِیْنَ کی واحد سنۃ ہے۔ اور بعض عرب کہتے ہیں: جمع سنوات ہے۔ اور بعض کہتے ہیں: سنھات ہے اور تصغیر سنیۃ اور سنیھۃ ہے۔

قولہ تعالیٰ: مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق سے محض حکمت اور صواب کا ارادہ کیا ہے اور اپنی صنعت وحکمت کے اظہار کے لیے اور اپنی قدرت اور اپنے علم پر دلالت کرنے کے لیے ایسا کیا اور تاکہ ہر نفس کو اس کی جزا دی جائے جو اس نے کمایا۔ اور یہی حق ہے۔

قولہ تعالیٰ: یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ آیات کی تفصیل سے مراد ان کی تبیین اور وضاحت کرنا ہے تاکہ ان سے اللہ تعالیٰ کی قدرت پر استدلال کیا جائے، اس لیے کہ رات اپنی تاریکی کے ساتھ اور دن اپنی روشنی کے ساتھ خاص ہے لیکن نہ یہ ان دونوں کا استحقاق ہے اور نہ اللہ کریم پر واجب ہے، پس یہ ان کے لیے اس پر دلیل ہے کہ یہ مرید (ارادہ کرنے والے) کے ارادہ سے ہوا ہے۔ اور ابن کثیر، ابو عمرو، حفص اور یعقوب نے یفصل یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ابوعبید اور ابو حاتم نے اسے ہی اختیار کیا ہے، کیونکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ اور اس کے بعد یہ ہے: وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ پس یہ اس کے تابع ہوگا۔ اور ابن السمیقع نے تُفَصَّل تاء کے ضمہ اور صاد کے فتحہ کے ساتھ فعل مجہول پڑھا ہے۔ اور الْاٰیٰتِ کو مرفوع پڑھا ہے اور باقیوں نے تعظیم کی بناء پر نون کے ساتھ نُفَصِّل پڑھا ہے۔

اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ۝

"بے شک گردش لیل ونہار میں اور جو کچھ پیدا فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں (ان میں اس کی) نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو متقی ہے"۔

سورۃ البقرہ وغیرہ میں اس کا معنی ومفہوم گزر چکا ہے۔ تحقیق کہا گیا ہے: بے شک اس کا سبب نزول یہ ہے کہ اہل مکہ نے علامت ونشانی کے بارے سوال کیا تو انہیں جواب یہ دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مصنوعات میں تامل اور نظر وفکر کریں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: لِقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ یعنی اس قوم کے لیے جو شرک سے بچتے ہیں۔ پس جس نے شرک کا ارتکاب کیا اور راہنمائی حاصل نہ کی تو پھر یہ نشانی (آیت) اس کے لیے نشانی نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ۝

''بے شک وہ لوگ جو امید نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی اور خوش وخرم ہیں دنیوی زندگی سے اور مطمئن ہو گئے ہیں اس (کے ساز وسامان) سے اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں سے غفلت برتتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے بہ سبب ان عملوں کے جو وہ کماتے رہے''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا اس میں یَرْجُوْنَ بمعنی یخافون ہے یعنی بے شک وہ لوگ جو ڈرتے نہیں۔ اسی معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

إذا لسعته النحل لم يَرْجُ لَسْعَها　　و خالفها فی بَیْت نُوبٍ عواسل(1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یَرْجُوْنَ بمعنی یطمعون ہے بے شک وہ لوگ جو حرص اور طمع نہیں رکھتے اور اس معنی میں ایک دوسرے شاعر کا قول ہے:

أیرجو بنو مروان سمعی وطاعتی　　وقومی تمیمٌ والفلاۃُ ورائیا(2)

پس رجاء خوف اور طمع کے معنی میں ہوتا ہے، یعنی نہ وہ سزا سے ڈرتے ہیں اور نہ ثواب کی حرص رکھتے ہیں۔ اور عذاب اور ثواب سے ملنے کو ان دونوں کو تفخیم کی خاطر لقاء اللہ سے تعبیر کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لقاء اپنے ظاہر معنی پر بھی جاری ہے اور وہ رؤیت (دیکھنا) ہے یعنی وہ جو ہماری رؤیت کی حرص اور طمع نہیں رکھتے۔ اور بعض علماء نے کہا ہے: رجاء خوف کے معنی میں واقع نہیں ہوتا مگر تب جب انکار کے ساتھ ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾ (نوح) اور بعض نے یہ کہا ہے: بلکہ ہر جگہ اس معنی میں واقع ہو سکتا ہے یہ معنی اس پر دلیل ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی وہ آخرت کے عوض اس دنیوی زندگی سے خوش وخرم ہیں پس انہوں نے اسی کے لیے عمل کیے۔ وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا یعنی وہ اس کے ساتھ خوش ہو گئے اور اسی میں راحت وسکون پا لیا، اطمأن کی اصل طأمن طمانینۃ ہے پس اس کی میم کو مقدم کیا گیا اور نون اور الف وصل (ہمزہ وصل) زائد کر دیا گیا، اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا اور وہ لوگ جو ہمارے دلائل سے غٰفِلُوْنَ غفلت برتتے ہیں یعنی نہ وہ ان کا اعتبار کرتے ہیں اور نہ ان میں غور وفکر کرتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ ان کا ٹھکانا اور ان کا مقام النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ دوزخ ہے بسبب کفر اور تکذیب کے جس کا ارتکاب وہ کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۹﴾

''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے پہنچائے گا انہیں ان کا رب (منزل مقصود تک) ان کے ایمان کے باعث، رواں ہوں گی ان کے نیچے نہریں نعمت (وسرور) کے باغوں میں''۔

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 423　　2۔ ایضاً

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یقیناً وہ لوگ جنہوں نے تصدیق کی۔ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ اور نیک عمل کیے ان کے لیے ان کا رب ہدایت میں اضافہ فرما دے گا، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد: 17) (اور جو لوگ راہ ہدایت پر چلے اللہ تعالیٰ بڑھا دیتا ہے ان کے نور ہدایت کو)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ ان کے ایمان کے باعث ان کا رب ان کی رہنمائی ایسے مکان کی طرف کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ اور ابوروق نے کہا ہے: ان کے ایمان کے باعث ان کا رب ان کی رہنمائی جنت کی طرف کر دے گا۔ اور عطیہ نے کہا ہے: یَهْدِیْهِمْ وہ انہیں ثواب اور جزا دے گا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ ان کا رب نور کے ساتھ پل صراط پر ان کی راہنمائی جنت کی طرف کرے گا، (یعنی) وہ ان کے لیے ایک نور پیدا فرما دے گا جس کے ساتھ وہ چلتے رہیں گے (1)۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت نقل کی جاتی ہے جو اسے تقویت پہنچاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مومن کو اس کا عمل انتہائی حسین صورت میں ملے گا پس وہ اسے مانوس کرے گا اور اس کی راہنمائی کرے گا اور کافر کا عمل انتہائی قبیح صورت میں اس سے ملے گا پس وہ اسے وحشت زدہ کر دے گا اور اسے گمراہ کر دے گا'' (2)۔ یہ حدیث کا معنی ہے۔ اور ابن جریج نے کہا ہے: ان کا رب ان کے عمل کو ان کے لیے ہادی بنا دے گا۔ اور حسن نے کہا ہے: یَهْدِیْهِمْ، یرحمهم کے معنی میں ہے (یعنی ان کا رب ان پر رحم فرمائے گا)

قولہ تعالیٰ: تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ کہا گیا ہے کہ کلام میں واؤ محذوف ہے، ای و تجری من تحتهم یعنی ان کے باغوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے تختوں اور محلات کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی اور سیر و تفریح اور کشادگی میں یہی احسن ہے۔

دَعْوٰىهُمْ فِیْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰﴾

''(بہار جنت کو دیکھ کر) ان کی صدا وہاں یہ ہوگی پاک ہے تو اے اللہ اور ان کی دعا یہ ہوگی کہ ''سلامتی ہو'' اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے سارے جہانوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: دَعْوٰىهُمْ فِیْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ، دَعْوٰىهُمْ یعنی ان کی پکار (اور دعا) اور الدعوی دعا یدعو کا مصدر ہے، جیسا الشکوی شکا یشکو کا مصدر ہے، یعنی جنت میں ان کی دعا اور پکار یہ ہوگی کہ وہ کہیں گے پاک ہے تو اے اللہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب وہ کوئی چیز مانگنے کا ارادہ کریں گے تو وہ سوال لفظ تسبیح سے شروع کریں گے اور اسے حمد کے ساتھ ختم کریں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی پکار اور ندا خدام کو ہوگی تاکہ وہ ان کے پاس وہ چیز لے کر آئیں جو ان کی خواہش اور چاہت ہے، پھر وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کریں گے اور یہ قول بھی ہے: بے شک یہاں دعا بمعنی تمنی ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَكُمْ فِیْهَا

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 104 2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 24-423

مَا تَدَّعُوْنَ ۝ (حم السجدہ) ای ما تتمنون (اور تمہارے لیے اس میں وہ ہوگا جس کی تم تمنا اور خواہش کرو گے)۔ واللہ اعلم
قولہ تعالیٰ: وَ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ یعنی ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی دعا یا فرشتے کی دعا یا ان میں سے بعض کی بعض کے لیے دعا یہ ہوگی کہ "سلامتی ہو" اور تحیہ کا مکمل مفہوم سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ والحمدللہ

قولہ تعالیٰ: وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ کہا گیا ہے: بے شک اہل جنت کے پاس سے جب کوئی پرندہ گزرے گا اور وہ اس کی خواہش کریں گے تو کہیں گے: سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ (پاک ہے تو اے اللہ!) تو فرشتہ اسے ان کے پاس لے آئے گا جس کی انہوں نے خواہش کی ہو گی، پس جب وہ کھا چکیں گے تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کریں گے پس ان کا سوال لفظ تسبیح کے ساتھ ہوگا اور اس کا اختتام لفظ حمد کے ساتھ ہوگا۔ اور ابو عبید نے ان کو تخفیف کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کے مابعد کو رفع دیا ہے۔ فرمایا: بلاشبہ ہم نے انہیں دیکھا ہے انہوں نے اسے اختیار کیا ہے اور انہوں نے اس کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے درمیان فرق کیا ہے: اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ (النور: 7) اور اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ (النور: 9) کیونکہ انہوں نے حکایت کا ارادہ کیا ہے جس وقت کہا جائے گا الحمدللہ۔

نحاس نے کہا ہے: خلیل اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ ان مخففہ من الثقیلہ ہے اور اس کا معنی ہے انه الحمد لله۔ محمد بن یزید نے کہا ہے کہ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بھی جائز ہے اس میں خفیہ ثقیلہ کے عمل کی طرح عمل کرتا ہے، لیکن رفع عمدہ اور زیادہ بہتر ہے۔ نحاس نے کہا ہے: ابو حاتم نے بیان کیا ہے کہ بلال بن ابی بردہ نے وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پڑھا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ ابن محیصن کی قراءت ہے، اسے غزنوی نے بیان کیا ہے کیونکہ وہ ان سے بیان کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ سبحان اللہ، الحمد للہ اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کو دعا کا نام دیا جا رہا ہے۔ مسلم اور بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصیبت اور کرب کے وقت کہا کرتے تھے: لا اله الا الله العظيم الحليم، لا اله إلا الله رب العرش العظيم، لا اله إلا الله ربّ السموات و رب الأرض و رب العرش الكريم (1) علامہ طبری نے کہا ہے: سلف اس دعا کے ساتھ پکارتے تھے اور اسے دعاء الکرب کا نام دیتے تھے۔ اور ابن عیینہ نے کہا ہے اس حال میں کہ ان سے اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: کیا تو جانتا نہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "جب میرے بندے کو مجھ سے کچھ مانگنے سے ثناء مشغول رکھتی ہے تو میں اسے اس سے افضل اور بہتر عطا فرماتا ہوں جو میں سوال کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں"۔ اور وہ چیز جس سے جھگڑا ختم ہو جاتا ہے اور یہ کہ اس کا نام دعا رکھا جاتا ہے اگرچہ اس میں دعا کے معنی کی کوئی شے نہیں ہے تو بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے لیے ہے اور اس کی ثنا اور تعریف کی بنا پر ہے، جیسا کہ وہ روایت جسے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ مچھلی والے کی دعا ہے جب انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ مچھلی کے پیٹ میں دعا کی لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (الانبیاء) پس اب کوئی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 939

مسلمان ان الفاظ کے ساتھ کسی شے کے بارے میں ہرگز دعا نہیں کرے گا مگر اس کی دعا قبول کی جائے گی (1)۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ سنت میں سے ہے کہ جو بندہ کھانا شروع کرے تو وہ اہل جنت کی اقتداء کرتے ہوئے کھانے، پینے کے آغاز میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھے اور جب اس سے فارغ ہو تو الحمدللہ کہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ اس بندے سے راضی اور خوش ہوتا ہے جو ایک لقمہ کھاتا ہے تو وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہے یا ایک گھونٹ پانی پیتا ہے تو وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہے'' (2)۔

مسئلہ نمبر 4۔ دعا مانگنے والے کے لیے مستحب ہے کہ وہ اپنی دعا کے آخر میں اسی طرح کہے جو اہل جنت کہیں گے۔ ان کی آخری پکار یہ ہو گی کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو سارے جہانوں کو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے اور بہت خوب ہے کہ وہ سورۂ والصافات کی آخری آیات پڑھے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی تنزیہ اور پاکی کو جامع ہیں ان چیزوں سے جو اس کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ اور مرسلین پر سلام بھیجنے کو اور اختتام الحمدللہ رب العالمین کے ساتھ ہے۔

وَ لَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ۚ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝

''اور اگر جلد بازی کرتا اللہ تعالیٰ لوگوں کو شر پہنچانے میں جیسے وہ جلد بازی کرتے ہیں بھلائی کے لیے تو پوری کر دی گئی ہوتی ان کی میعاد (لیکن یوں نہیں بلکہ) ہم چھوڑے رکھتے ہیں انہیں جو توقع نہیں رکھتے ہماری ملاقات کی تاکہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو سزا دینے میں جلدی کرتا جیسے وہ ثواب اور بھلائی کے لیے جلد بازی کرتے ہیں تو وہ یقیناً مر چکے ہوتے، کیونکہ وہ دنیا میں ضعیف اور کمزور مخلوق کی صورت میں پیدا کیے گئے ہیں اور قیامت کے دن وہ اس طرح نہ ہوں گے، کیونکہ قیامت کے دن انہیں باقی رہنے کے لیے تخلیق کیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ مکروہ اور تکلیف وہ دعا کو قبول کرنے میں اسی طرح کرتا جیسے وہ چاہتے ہیں کہ خیر اور بھلائی کی دعا قبول کرنے میں وہ ان کے ساتھ کرے تو یقیناً وہ انہیں ہلاک کر چکا ہوتا۔ اور لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ کا معنی یہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ کافر کے ساتھ خاص ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ کافر کو اس کے کفر پر عذاب دینے میں جلدی کرتا جیسا کہ اس نے اس کو مال اور اولاد میں سے دنیا کی بھلائی عطا

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 188، (بتغیر قلیل) ایضاً، حدیث نمبر 3427، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، جلد 2، صفحہ 352

کرنے میں جلدی کی ہے تو یقیناً وہ اس کے لیے اس کی میعاد پوری کرنے میں جلدی کرتا تاکہ وہ آخرت کے عذاب کو جلدی پائے۔ یہ ابن اسحاق نے کہا ہے(1)۔

مقاتل نے کہا ہے: وہ نضر بن حارث کا یہ قول ہے: اے اللہ! اگر یہی تیری طرف سے سچ ہو تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، پس اگر اللہ تعالیٰ ان کے لیے اس کی جلدی کرتا تو یقیناً وہ ہلاک ہو جاتے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت ایسے آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اپنی ذات یا اپنے مال یا اپنی اولاد کو بددعا دیتا ہے جب وہ غصے میں ہوتا ہے: اے اللہ اسے ہلاک کر دے، اے اللہ! اس کے لیے اس میں برکت نہ دے اور اس پر لعنت بھیج یا اسی طرح کی اور بد دعائیں(2)۔ پس اگر اسے اس کی طرف سے قبول کر لیا جائے جیسے خیر اور بھلائی کی دعا کو قبول کیا جاتا ہے تو ان کی میعاد پوری کر دی گئی ہوتی۔ پس یہ آیت اخلاق ذمیمہ کی مذمت کرنے کے لیے نازل ہوئی۔ یہ ان بعض لوگوں کے بارے میں ہے جو خیر اور بھلائی کی دعا کرتے ہیں اور اس کی جلدی قبولیت کی خواہش رکھتے ہیں پھر کبھی کبھار بداخلاقی انہیں شر کے بارے دعا پر ابھارتی ہے۔ پس اگر وہ ان کے لیے (اس کے بارے) جلدی کرتا تو وہ یقیناً ہلاک ہو جاتے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس دعا کی قبولیت میں اختلاف کیا گیا ہے۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "بے شک میں نے اللہ تعالیٰ عزوجل سے التجا کی ہے کہ وہ کسی دوست کی دعا اپنے دوست کے خلاف قبول نہ کرے"۔ اور شہر بن حوشب نے کہا ہے: میں نے بعض کتب میں پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان ملائکہ کو فرماتا ہے جو بندوں پر مقرر کیے گئے ہیں: تم میرے بندے کے خلاف اس حال میں کچھ نہ لکھو جو اسے غمزدہ کر کے کسی شی پر مجبور کر دے۔ یہ اللہ تالیٰ کی جانب سے اس پر لطف و عنایت ہے۔

بعض نے کہا ہے: کبھی ایسی دعا قبول کر لی جاتی ہے۔ اور انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں کتاب کے آخر میں بیان کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں غزوۂ بطن بواط (بواط جہینہ کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے) میں چلے اور آپ مجدی بن عمرو جہنی کو تلاش کر رہے تھے اور ہم میں سے پانچ، چھ یا سات آدمیوں کے پاس ایک اونٹ تھا اور ہم باری باری اس پر سوار ہوتے تھے، پس انصار میں سے ایک آدمی کی باری اونٹ پر سوار ہونے کی آئی پس اس نے اسے بٹھایا اور اس پر سوار ہو گیا، پھر اس نے اسے اٹھایا اس نے توقف کیا اور نہ اٹھا۔ پس اس نے اسے کہا: شاہ (یعنی اونٹ کو جھڑکا) اللہ تعالیٰ تجھ پر لعنت کرے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنے اونٹ کو لعنت کرنے والا کون ہے"؟ اس نے کہا: میں ہوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو اس سے نیچے اتر آ اور تو ملعون کے ساتھ ہمارے ساتھ نہ چل۔ تم نہ بددعا دو اپنی ذاتوں کو اور نہ بددعا دو اپنی اولاد کو اور نہ بددعا کرو اپنے مالوں کے لیے تم اللہ تعالیٰ سے ایسی ساعت میں موافقت نہ کرو کہ جس میں اس سے عطا کا سوال کیا جاتا ہے اور تمہارے لیے وہ اسے قبول فرما لیتا ہے"(3)۔

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 425	2۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 108	3۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 416

کتاب مسلم کے علاوہ کسی اور میں ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ ایک سفر میں تھے تو ایک آدمی نے اپنی اونٹنی کو لعنت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہاں ہے وہ جس نے اپنی ناقہ پر لعنت کی ہے؟''۔ تو اس آدمی نے کہا: میں یہ ہوں یا رسول اللہ! ﷺ، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو اسے اپنے پیچھے چھوڑ دے تحقیق اس کے حق میں تیری بددعا قبول ہو چکی ہے''۔ اسے حلیمی نے منہاج الدین میں ذکر کیا ہے، شأ، یہ لفظ سین اور شین دونوں کے ساتھ روایت کیا جاتا ہے اور اس کا معنی اونٹ کو جھڑکنا ہے اور یہ بمعنی سر (تو چل) ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ علماء نے بیان کیا ہے کہ تعجیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور استعجال (عجلت کا مطالبہ) بندے کی جانب سے ہوتا ہے۔ اور ابو علی نے کہا ہے: یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اور کلام میں حذف ہے ای ولو یعجل اللہ للناس الشر تعجیلا مثل استعجالھم بالخیر (اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو شر پہنچانے میں اتنی ہی جلدی کرے جیسے وہ انہیں خیر اور بھلائی پہنچانے کے لیے جلدی کرتا ہے) پھر تعجیلا کو کلام سے حذف کر دیا گیا ہے اور اس کی صفت کو اس کے قائم مقام رکھ دیا، پھر اس کی صفت کو حذف کر دیا اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھ دیا۔ یہ خلیل اور سیبویہ کا مذہب ہے۔ اور اخفش اور فراء کے قول کے مطابق یہ کاستعجالھم ہے پھر کاف کو حذف کر دیا اور اسے نصب دے دی۔ فراء نے کہا ہے: جیسے تو کہتا ہے: ضربت زیداً ضربک ای کضربک (یعنی اس میں کاف کو حذف کیا گیا ہے)

اور ابن عامر نے لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ پڑھا ہے اور یہ قراءت عمدہ ہے کیونکہ اس قول کے ساتھ متصل ہے: وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ۔

قولہ تعالیٰ: فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا یعنی وہ انہیں شر پہنچانے میں جلدی نہیں کرتا بسا اوقات ان میں سے کوئی توبہ کرنے والا توبہ کر لیتا ہے یا ان کی پشتوں سے کوئی مومن پیدا ہوتا ہے۔ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ تاکہ وہ اپنی سرکشی میں متحیر رہیں۔ طغیان کا معنی بلندی اور رفعت ہے۔ یہ سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت میں اہل مکہ مراد ہیں۔ اور یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے یہ کہا: اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ الآیہ (الانفال: 32) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، واللہ اعلم

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآىِٕمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾

''اور جب پہنچتی ہے انسانوں کو کوئی تکلیف (تو اس وقت) پکارتا ہے ہمیں لیٹا ہوا ہو یا بیٹھا ہوا ہو یا کھڑا ہوا ہو، پھر جب ہم دور کر دیتے ہیں اس سے اس کی تکلیف (تو) چل دیتا ہے جیسے اس نے ہمیں (کبھی) پکارا ہی نہیں تھا کسی تکلیف میں جو اسے پہنچی تھی، اسی طرح آراستہ کر دیئے گئے حد سے بڑھنے والوں کے لیے وہ کرتوت جو وہ کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ کہا گیا ہے کہ یہاں انسان سے مراد کافر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ابو

حذیفہ بن مغیرہ مشرک ہے، اسے کوئی تکلیف، شدت اور مشقت پہنچی تھی۔ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ وہ ہمیں پکارتا اپنے پہلو پر لیٹے ہوئے۔

اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا (یا بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے ہو) اس سے مراد اس کے جمیع حالات ہیں، کیونکہ انسان ان تین حالات میں سے کسی ایک سے بھاگ نہیں سکتا (1)۔ بعض نے کہا ہے: بے شک آغاز لیٹنے سے کیا ہے کیونکہ اسے امر غالب میں تکلیف جتنی شدید ترین ہوتی ہے، تو وہ اتنا زیادہ پکارتا ہے اور اس کی کوشش میں بھی اتنی ہی شدید ہوتی ہے، پھر بیٹھنے کا ذکر کیا اور پھر کھڑے ہونے کا۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ پھر جب ہم اس سے اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو چل دیتا ہے یعنی اپنے کفر پر برقرار رہتا ہے اور شکر ادا نہیں کرتا اور نہ ہی نصیحت حاصل کرتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ بہت سے مخلوط موحدین کی صفت ہے، جب اسے عافیت پہنچتی ہے تو وہ گناہوں کی اسی روش پر چل دیتا ہے جس پر وہ پہلے تھا۔ پس یہ آیت کافر اور غیر کافر تمام کو عام ہے۔ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اخفش نے کہا: یہ کان ثقیلہ سے مخففہ بنایا گیا ہے اور اس کا معنی کأنہ ہے اور یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

وَیْ كَاَنْ مَنْ یکن له نَشَبٌ یُحْبَبْ　　ومن یفتقر یعش عیش ضُرّ

كَذٰلِكَ زُيِّنَ یعنی جس طرح اس کے لیے تکلیف اور آزمائش کے وقت دعا کو اور آسودگی اور خوشحالی کے وقت اعراض کو آراستہ کیا گیا۔ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ اسی طرح مشرکوں کے لیے کفر و معاصی میں سے ان کے اعمال آراستہ کر دیئے گئے۔ اور اس تزیین کے بارے میں یہ بھی جائز ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ شیطان کی طرف سے ہو۔ اور اس کا گمراہ کرنا اس کا کفر کی طرف دعوت دینا ہے۔

وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ⑬

''اور بے شک ہم نے ہلاک کر دیا کئی قوموں کو جو تم سے پہلے تھیں جب وہ زیادتیاں کرنے لگے۔ اور آئے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں لے کر اور وہ (ایسے) نہیں تھے کہ ایمان لاتے، اسی طرح ہم سزا دیتے ہیں مجرم قوم کو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا یعنی جب اہل مکہ سے قبل گزشتہ امتوں نے زیادتیاں کیں تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ لَمَّا ظَلَمُوْا یعنی جب انہوں نے کفر اور شرک کیا۔ وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ اور ان کے پاس ان کے رسول آئے واضح معجزات اور روشن دلیلیں لے کر۔ وَ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا یعنی ہم نے انہیں ہلاک کر دیا کیونکہ ہم جانتے تھے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کفار مکہ کو گزشتہ امتوں کے عذاب سے ڈرا رہا ہے، یعنی ہم ان کے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے کے سبب انہیں ہلاک کرنے پر قادر ہیں لیکن ہم انہیں مہلت دے رہے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 142

وہ بھی ہیں جو ایمان لے آئیں گے یا ان کی صلبوں سے وہ نکلیں گے جو ایمان لائیں گے۔ یہ آیت ان گمراہ لوگوں کا رد ہے جو ہدایت اور ایمان کے مخلوق ہونے کا قول کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا کا معنی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر پر انہیں جزا یہ دی کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝

''پھر ہم نے بنایا تمہیں جانشین زمین میں ان کے بعد تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ (کم اور خلائف) دونوں مفعول ہیں۔ اور الخلائف خلیفہ کی جمع ہے اور اس کا ذکر سورۂ انعام کے آخر میں گزر چکا ہے، یعنی ہم نے تمہیں زمین میں سکونت اختیار کرنے والا بنایا۔ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یعنی ہلاک ہونے والی بستیوں کے بعد۔ لِنَنْظُرَ یہ لام کی کے سبب منصوب ہے۔ اور اس کی نظائر اور مثالیں پہلے گزر چکی ہیں، یعنی تاکہ تم سے وہ عمل واقع ہو جس کے سبب تم ثواب اور عقاب کے مستحق بن جاؤ گے اور وہ اسے مسلسل غیب جانتا رہا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تاکہ وہ تمہارے ساتھ اظہار عدل کے لیے مخیر (امتحان لینے والا) کے معاملہ کی طرح معاملہ کرے۔ اور یہ قول بھی ہے: نظر کی نسبت رسل کی طرف ہے، یعنی تاکہ ہمارے رسول اور ہمارے اولیاء دیکھ لیں تمہارے اعمال کیسے ہیں۔ اور كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ کے سبب منصوب ہے، کیونکہ استفہام کے لیے صدر کلام ضروری ہے اور اس کا ماقبل اس میں عمل نہیں کر سکتا۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَاۤ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝

''اور جب پڑھی جاتی ہیں ان پر ہماری روشن آیتیں (تو) کہنے لگتے ہیں وہ جو توقع نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی کہ لے آیئے (دوسرا) قرآن اس (قرآن) کے علاوہ یا ردو بدل کر دیجئے اسی میں، فرمایئے مجھے اختیار نہیں کہ ردو بدل کر دوں اس میں اپنی مرضی سے، میں نہیں پیروی کرتا (کسی چیز کی) بجز اس کے جو وحی کی جاتی ہے میری طرف، میں ڈرتا ہوں اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں بڑے دن کے عذاب سے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا، تُتْلٰى یعنی تقرء (اور جب ان پر پڑھی جاتی ہیں ہماری آیات) اور بینات حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی واضح اور بین آیتیں جن میں نہ کوئی التباس ہے اور نہ کوئی اشکال۔ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا یعنی جو نہ یوم بعث اور حساب سے ڈرتے ہیں اور نہ ثواب کی امید رکھتے ہیں (وہ کہنے لگتے ہیں) حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد مکہ کے رہنے والے مشرک ہیں (1)۔ ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَاۤ اَوْ بَدِّلْهُ اس میں

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 144

تبدیلی کرنے اور اس کے علاوہ دوسرا (قرآن) لانے میں فرق یہ ہے کہ اس کو تبدیل کرنے میں یہ جائز نہیں کہ یہ اس کے ساتھ ہو اور اس کے علاوہ دوسرا (قرآن) لانے میں یہ جائز ہو سکتا ہے کہ یہ اس کے ساتھ ہو۔ ان کے اس قول میں تین وجوہ ہیں۔ (۱) کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا کہ وہ وعدہ کو وعید میں اور وعید کو وعدہ میں، حلال کو حرام میں اور حرام کو حلال میں بدل دیں، یہ ابن جریر طبری کا قول ہے۔ (۲) انہوں نے آپ سے یہ سوال کیا کہ ان کے معبودوں کے عیوب کے بارے میں اور ان کے عقل مندوں کو احمق اور بے وقوف کہے جانے کے بارے میں جو کچھ قرآن کریم میں ہے اسے ساقط کر دیں، ختم کر دیں۔ یہ ابن عیسیٰ کا قول ہے۔ (۳) کہ انہوں نے آپ سے یہ سوال کیا کہ موت کے بعد زندہ کیے جانے اور اٹھائے جانے کا جو ذکر قرآن کریم میں ہے اسے ساقط کر دیں، زائل کر دیں۔ یہ زجاج نے کہا ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے میرے اختیار میں نہیں۔ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ کہ میں اپنی طرف سے اس میں رد و بدل کر دوں، جیسا کہ مجھے یہ اختیار نہیں کہ میں اسے رد کر دوں اور جھٹلا دوں۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ یعنی میں اتباع نہیں کرتا مگر اس کی جس کی میں تم پر وعدہ و وعید، حرام و حلال اور امر و نہی میں سے تلاوت کرتا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اور اس استدلال میں خاصا بعد ہے، کیونکہ آیت مشرکوں کے اس مطالبے کے بارے میں وارد ہوئی ہے کہ نظم (والفاظ) کے اعتبار سے قرآن کی مثل لاؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر قادر نہیں اور انہوں نے آپ سے الفاظ کے بغیر حکم تبدیل کرنے کا سوال نہیں کیا، کیونکہ وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں تبھی ہو سکتا ہے جب یہ وحی ہو آپ کی اپنی مرضی سے نہ ہو، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ یعنی میں ڈرتا ہوں اگر میں اس میں تغیر و تبدل کر کے یا اس کے مطابق عمل ترک کر کے اپنے رب کی مخالفت کروں۔ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ یعنی یوم قیامت کے عذاب سے(2)۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَ لَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۶

"آپ فرما دیجئے اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو میں نہ پڑھتا اسے تم پر اور نہ وہ آگاہ کرتا تمہیں اس سے، میں تو گزار چکا ہوں تمہارے درمیان عمر (کا ایک حصہ) اس سے پہلے، کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے"۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَ لَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ مجھے تمہاری طرف نہ بھیجتا اور (نہ) میں تم پر قرآن کریم پڑھتا اور نہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے بارے آگاہ کرتا اور نہ تمہیں خبر دیتا۔ کہا جاتا ہے: دریتُ الشیء (میں نے کسی شی کو جان لیا) و أدرانی اللہ بہ (اور اللہ نے مجھے اس کے بارے آگاہ کیا) و دریتُہ و دریتُ بہ (میں نے اسے جان لیا اور مجھے اس کے بارے آگاہ کیا گیا) اور درایت میں دھوکہ اور فریب دینا کا معنی پایا جاتا ہے اور اسی سے ہے

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 426 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 427

دریتُ الرجل یعنی ختلتہ (میں نے اسے دھوکا دیا)۔ اسی وجہ سے الداری مطلق اللہ تعالیٰ کے حق میں نہیں استعمال کیا جا سکتا اور یہ بھی کہ اس میں توقیف نہیں ہے۔ اور ابن کثیر نے ولأدراکم بہ لام اور ہمزہ کے درمیان بغیر الف کے اسے پڑھا ہے اور اس کا معنی ہے: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ تمہیں اس کے بارے آگاہ کر دیتا بغیر اس کے کہ میں تم پر اس کی تلاوت کرتا پس یہ لام تاکید ہے جو فعل کے الف پر داخل ہے۔ حضرت ابن عباس اور حسن رضی اللہ عنہم نے ولا أدراتکم بہ یاء کو الف سے تبدیل کر کے پڑھا ہے، اور یہ بنی عقیل کی لغت پر ہے، شاعر نے کہا ہے:

لعمرك ما أخشى التّصعلك مابقي   على الأرض قيْسِي يسوق الأباعرا(1)

اور دوسرے نے کہا ہے:

ألا آذنتْ أهلَ اليمامة طيِّئ   بحرب كناصات الأغرّ المشهرِ(2)

ابو حاتم نے کہا ہے: میں نے اصمعی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے عمرو بن علاء سے پوچھا: کیا حسن کی قراءت ولا ادراتکم بہ کی کوئی وجہ اور دلیل ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: نہیں۔ اور ابو عبید نے کہا ہے: حسن کی قراءت ولا أدراتکم بہ کی سوائے غلط ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ نحاس نے کہا ہے: ابو عبید کے قول کا معنی ہے: کوئی وجہ نہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہے غلط ہونے پر، کیونکہ کہا جاتا ہے: دریتُ أی علمتُ (میں نے جان لیا) اور أدریت غیری (میں نے اپنے غیر کو آگاہ کیا) اور کہا جاتا ہے: درأت أی دفعت (میں نے دور کیا، میں نے دفاع کیا) پس دریت اور درآت کے درمیان غلطی واقع ہو رہی ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: جو میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ حسن اس میں ولا أدریتکم بہ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پس انہوں نے بنی حارث بن کعب کی لغت کے مطابق یا کو الف سے بدل دیا ہے، (کیونکہ) وہ یا کو الف سے بدل دیتے ہیں جب اس کا ماقبل مفتوح ہو، جیسا کہ اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ (طٰہٰ:63)

مہدوی نے کہا ہے: جس نے أدراتکم پڑھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمزہ کی اصل یا ہے پس اس کی اصل أدریتکم ہے پھر یاء کو الف سے بدل دیا گیا اگرچہ وہ ساکن ہے، جیسا کہ کہا: یا یس یہ اصل میں ییبس ہے۔ اور طائی اصل میں طیئ ہے۔ پھر الف کو ہمزہ سے بدل دیا گیا ہے ان کی لغت کے مطابق جنہوں نے العالم میں العألم اور الخاتم اور الحأتم کہا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ غلط ہے۔ اور حسن سے ایک روایت ولا أدرأتکم ہمزہ کے ساتھ بھی ہے اور ابو حاتم وغیرہ نے کلام کی ہے کہ وہ ہمزہ کے بغیر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ درأت بمعنی دفعت سے ہو، یعنی میں تمہیں حکم نہ دیتا تھا کہ تم دور ہو جاؤ اور قرآن کے بدلے کفر کو چھوڑ دو۔

قولہ تعالیٰ: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا یہ ظرف ہے، یعنی زمانے کی ایک مقدار اور وہ چالیس برس ہے (یعنی میں تم میں اتنا عرصہ گزار چکا ہوں) مِّنْ قَبْلِهٖ قرآن کریم سے پہلے۔ تم مجھے صدق اور امانت کے سبب پہچانتے ہو، نہ میں پڑھتا ہوں اور نہ لکھتا ہوں، پھر میں تمہارے معجزات لے کر آیا۔

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 113   2۔ ایضاً

اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ نہیں ہو سکتا مگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہ کہ میری جانب سے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَبِثۡتُ فِیۡكُمۡ عُمُرًا کا معنی ہے میں نے اپنی جوانی کی مدت تمہارے درمیان گزاری ہے میں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی، کیا تم اب مجھ سے یہ چاہتے ہو حالانکہ میں چالیس سال کی عمر کو پہنچ چکا ہوں کہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کروں اور میں اس میں ردوبدل کروں جو وہ مجھ پر نازل فرماتا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا: آپ نے ان میں چالیس برس گزارے اور دو سال اس حال میں گزارے کہ انبیاء علیہم السلام کے خواب دیکھتے رہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باسٹھ برس کی عمر میں وصال فرمایا۔

فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوۡ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۱۷﴾

''پس کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو افتراء باندھے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا یا جھٹلائے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو بے شک مجرم فلاح نہیں پاتے''۔

یہ استفہام بمعنی انکار ہے، یعنی اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا افتراء باندھا اور اس کے کلام کو بدل دیا اور اس کی طرف ایسی شے کی نسبت کر دی جو اس نے نازل نہیں کی۔ اور اسی طرح تم سے زیادہ کوئی ظلم کرنے والا نہیں جب تم نے قرآن کریم کا انکار کیا اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹا افترا باندھا اور تم نے یہ کہا: یہ اس کا کلام نہیں۔ اور یہ اس میں سے ہے جس کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ انہیں یہ کہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ابتداءً اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ افترا باندھنے والا مشرک ہے اور آیات کو جھٹلانے والا اہل کتاب میں سے ہے۔ اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ۔

وَيَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمۡ وَلَا يَنۡفَعُهُمۡ وَيَقُوۡلُوۡنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ قُلۡ اَتُنَبِّـــُٔوۡنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعۡلَمُ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۱۸﴾

''اور (یہ مشرک) عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی چیزوں کی جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ نفع پہنچا سکتی ہیں اور وہ کہتے ہیں یہ (معبود) ہمارے سفارشی ہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں، آپ فرمایئے: کیا تم آگاہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو اس بات سے جو وہ نہیں جانتا نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں، پاک ہے وہ اور بلند و بالا ہے اس شرک سے وہ کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَيَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمۡ وَلَا يَنۡفَعُهُمۡ (اس میں من دون اللہ سے) مراد بت ہیں۔ وَيَقُوۡلُوۡنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰهِ یہ ان کی طرف سے جہالت کی انتہا ہے، اس حیثیت سے کہ انجام کار کے طور پر شفاعت کا انتظار ان سے کر رہے ہیں جن سے حال میں نہ نفع پایا جا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: شُفَعَآؤُنَا یعنی یہ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس دنیا میں ہماری معاشی اصلاح کے بارے میں سفارش کریں گے۔

قُلۡ اَتُنَبِّـــُٔوۡنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعۡلَمُ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الۡاَرۡضِ عام قراءت تنبئون تشدید کے ساتھ ہے۔ اور ابو السمال

العدوی نے أتنبئون اللہ مخفف کر کے پڑھا ہے۔ یہ أنبا ینبئ سے ہے۔ اور عام قراءت نبا ینبی تنبئۃ سے ہے۔ اور دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں دونوں جمع ہیں: مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۖ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝ (التحریم) یعنی کیا تم اللہ تعالیٰ کو خبر دے رہے ہو کہ اس کا اس کی بادشاہی میں کوئی شریک ہے یا اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارشی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے لیے کسی شریک کو نہیں جانتا آسمانوں میں اور زمین میں، کیونکہ اس کا کوئی شریک نہیں پس اسی لیے وہ اسے نہیں جانتا۔ اس کی نظیر یہ ارشاد ہے: اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ (الرعد: 33) پھر اس نے اپنی ذات کی پاکی بیان کی اور اسے شرک سے پاکیزہ قرار دیا اور فرمایا: سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ یعنی وہ اس سے عظیم تر ہے کہ اس کا کوئی شریک ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ عبادت کرتے ہیں ان کی جو نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں اور نہ تمیز کر سکتے ہیں اور وہ کہتے ہیں: یہ (معبود) اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ پس وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ کیا اس نے تمہیں تیار کیا ہے کہ تم اسے اس بات کے بارے آگاہ کرو جو وہ نہیں جانتا، اس کی ذات پاک ہے اور اس سے بلند تر ہے جسے وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ حمزہ اور کسائی نے تشرکون تا کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے ہی ابو عبید نے اختیار کیا ہے۔ اور باقیوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

''اور نہیں تھے لوگ (ابتداء میں) مگر ایک ہی امت پھر (اپنی کجروی سے) باہم اختلاف کرنے لگے اور اگر ایک بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی آپ کے رب کی طرف سے تو فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان ان امور میں جن میں وہ اختلاف کیا کرتے ہیں''۔

اس کا معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے اور اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور زجاج نے کہا ہے: وہ عرب شرک پر تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہر بچہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے، پھر وہ بالغ ہونے کے وقت مختلف ہو جاتے ہیں۔ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ یہ قضاء و قدر کی طرف اشارہ ہے، یعنی اگر اس کے حکم میں پہلے سے نہ ہوتا کہ وہ ان کے درمیان ان امور میں قیامت سے پہلے فیصلہ نہیں کرے گا جن میں ثواب و عقاب کے اعتبار سے وہ اختلاف کرتے ہیں تو ان کے درمیان دنیا میں فیصلہ کر دیا جاتا، پس وہ مومنوں کو ان کے اعمال کے عوض جنت میں اور کافروں کو ان کے اعمال کے بدلے جہنم میں داخل کر دیتا لیکن اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے کرتوتوں کا علم رکھنے کے باوجود پہلے سے ایک مدت مقرر ہے اور اس نے ان کے لیے جائے وعدہ قیامت کو بنا رکھا ہے (1)۔ یہ حسن نے کہا ہے۔ اور ابو روق نے کہا ہے: لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ تو ان پر قیامت قائم کر دیتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو وہ ان کی ہلاکت سے فارغ ہو چکا ہوتا۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الکلمۃ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو مہلت دی ہے کہ وہ انہیں دنیا میں یوم قیامت تک عذاب کے ساتھ ہلاک نہیں کرے گا، پس

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 146

اگر یہ مہلت نہ ہوتی تو ان کے درمیان عذاب نازل کرتے یا قیامت قائم کر کے فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور یہ آیت حضور نبی کریم ﷺ کے لیے باعث تسلی ہے ان لوگوں سے عذاب کی تاخیر کے بارے میں جنہوں نے آپ کے ساتھ کفر اختیار کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلمہ سابقہ یہ ہے کہ وہ کسی کو بغیر حجت اور دلیل کے نہیں پکڑے گا اور وہ رسولوں کو بھیجتا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ (الاسراء)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الکلمہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: سبقت رحمتی غضبی (1) (میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے) اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ گنہگاروں کو توبہ کی مہلت نہ دیتا۔ اور عیسیٰ نے لَقَضٰی کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝

''اور کہتے ہیں کیوں نہ نازل کی گئی ان پر کوئی آیت ان کے رب کی طرف سے؟ سو آپ فرمایئے: غیب تو صرف اللہ کے لیے ہے پس انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں''۔

مراد اہل مکہ ہیں، یعنی کیوں نہ نازل کی گئی ان پر کوئی آیت، یعنی معجزہ جو اس معجزہ کے سوا ہوتا کہ وہ ہمارے لیے پہاڑوں کو سونا بنا دے اور اس کے لیے انتہائی خوبصورت (سونے کا) گھر ہو اور ہمارے لیے انہیں زندہ کرے جو ہمارے آباء و اجداد میں سے مر چکے ہیں۔ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد عصا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا تھا (یعنی ایسا معجزہ کیوں نہ نازل کیا گیا) فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ یعنی آپ فرما دیجئے اے محمد! ﷺ بے شک آیت کا نازل ہونا غیب ہے۔ فَانْتَظِرُوْا پس تم انتظار کرو۔ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ بے شک میں بھی اس کے نازل ہونے کا تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: حق کو باطل پر غالب کرنے کے بارے ہمارے درمیان تم اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا انتظار کرو۔

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ۭ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ۝۲۱

''اور جب ہم لطف اندوز کرتے ہیں لوگوں کو (اپنی) رحمت سے اس تکلیف کے بعد جو انہیں پہنچی تو فوراً وہ مکر و فریب کرنے لگتے ہیں ہماری آیتوں میں، فرمایئے: اللہ زیادہ تیز ہے اس فریب کی سزا دینے میں، بے شک ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) قلم بند کر رہے ہیں جو فریب تم کر رہے ہو''۔

مراد کفار مکہ ہیں۔ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ کہا گیا ہے: مراد شدت اور تنگی کے بعد آسودگی اور خوشحالی کا آنا ہے اور خشک سالی کے بعد شادابی کا آنا ہے (2)۔ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا اس میں مکر سے مراد استہزا اور تکذیب ہے۔ (تو فوراً وہ ہماری آیتوں کے ساتھ استہزا اور ان کی تکذیب کرنے لگتے ہیں) اور خلیل اور سیبویہ کے قول کے مطابق وَاِذَآ اَذَقْنَا کا

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، جلد 2، صفحہ 1127　2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 429

جواب اِذَا لَهُمْ ہے۔ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ مَكْرًا یہ بیان ہونے کی بنا پر منصوب ہے، یعنی وہ ان کے مکر و فریب کی جزا کے طور پر سزا دینے میں بہت جلدی کرنے والا ہے، یعنی جو کچھ انہوں نے مکر و فریب سے کیا اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ انہیں ہلاک کرنے کے لیے وہ ان پر عذاب لا سکتا ہے۔ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ یہاں رسل سے مراد کراما کاتبین ہیں۔ اور قراءت عامہ تمکرون تا خطاب کے ساتھ ہے اور یعقوب نے اردیس کی روایت میں اور ابو عمرو نے ہارون العتکی کی روایت میں یمکرون یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس قول کی وجہ سے: اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْۤ اٰيَاتِنَا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابوسفیان نے عرض کی: آپ کی دعا سے ہم پر قحط مسلط کر دیا گیا ہے پس اگر آپ ہمیں سیراب کر دیں تو ہم آپ کی تصدیق کر دیں گے پس آپ ﷺ کے بارش کی دعا کرنے کے ساتھ انہیں بارش عطا کر دی گئی لیکن وہ ایمان نہ لائے، پس یہی ان کا مکر اور دھوکا تھا۔

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝۲۲ فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۳

”وہی ہے جو سیر کراتا ہے تمہیں خشک زمین اور سمندر میں یہاں تک کہ جب تم سوار ہوتے ہو کشتیوں میں اور وہ چلنے لگتی ہیں مسافروں کو لے کر موافق ہوا کی وجہ سے اور وہ مسرور ہوتے ہیں اس سے (تو اچانک) آ لیتی ہے انہیں تند و تیز ہوا اور آ لیتی ہیں انہیں موجیں ہر جگہ (طرف) سے اور وہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ انہیں گھیر لیا گیا تو (اس وقت) پکارتے ہیں اللہ تعالیٰ کو خالص اسی کی عبادت کرتے ہوئے (کہتے ہیں اے کریم!) اگر تو نے بچا لیا ہمیں اس (طوفان) سے تو ہم یقیناً ہو جائیں گے (تیرے) شکر گزار (بندوں) سے۔ پھر جب وہ بچا لیتا ہے انہیں تو وہ سرکشی کرنے لگتے ہیں زمین میں ناحق، اے لوگو! تمہاری سرکشی کا وبال تمہیں پر پڑے گا لطف اٹھا لو دنیوی زندگی سے پھر ہماری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے تمہیں، پھر ہم آگاہ کریں گے تمہیں جو کچھ تم کیا کرتے تھے“۔

قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ یعنی وہ تمہیں خشکی میں چوپاؤں پر اور سمندر میں کشتیوں پر سوار کرتا ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ سیر میں تمہاری حفاظت کرتا ہے۔ اور یہ آیت ان نعمتوں کے شمار کرنے کو متضمن ہے جو اس کے راستے میں لوگوں کو جانوروں پر اور سمندر میں سوار کرنے میں سے پائی جاتی ہیں۔ سمندر میں سوار ہونے کے بارے میں کلام سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور يُسَيِّرُكُمْ قراءت عامہ ہے۔ ابن عامر

نے ینشرہ کم نون اور شین کے ساتھ قراءت کی ہے، یعنی وہ تمہیں پھیلاتا ہے اور متفرق کر دیتا ہے۔ اور الفلک کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے اور اسے مذکر اور مونث دونوں طرح لایا جاتا ہے۔ اور اس کے بارے گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ اور قولہ: وَجَرَيْنَ بِهِمْ یہ خطاب سے غیب کی طرف خروج ہے اور قرآن کریم اور اشعار عرب میں ایسا کثرت سے موجود ہے، جیسا کہ نابغہ نے کہا ہے:

یا دارمیۃ بالعَلْیاء فالسَّند أقْوَت وطال علیها سالف الأمَد

ابن انباری نے کہا ہے: لغت میں یہ جائز ہے کہ غیب کے خطاب سے صراحۃ لفظ خطاب کی طرف رجوع کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾ (الدہر) (اور پلائے گا انہیں ان کا پروردگار نہایت پاکیزہ شراب (انہیں کہا جائے گا) یہ تمہارا صلہ ہے اور (مبارک ہو) تمہاری کوششیں مقبول ہوئیں) تو اس میں کاف کو ہا کے بدلے لایا گیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا اس کے بارے میں گفتگو سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ، جاتھا میں ہا ضمیر سفینہ (کشتی) کے لیے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا مرجع ریح طیبۃ ہے۔ اور العاصف کا معنی شدید اور تند و تیز (ہوا) ہے۔ کہا جاتا ہے: عصفت الریح و أعصفت، فهي عاصف و معصف و معصفہ أی شدیدۃ (یعنی شدید آندھی) شاعر کا قول ہے:

حتی إذا أعصفت ریح مُزَعْزِعۃ فیها قطار ورعد صوتہ زَجِل(1)

اور فرمایا: عاصف مذکر لایا گیا ہے، کیونکہ لفظ ریح مذکر ہے اور یہی قاصف (ہر شے کو توڑنے والی) بھی ہے۔ اور طیبہ سے مراد ایسی ہوا ہے جو نہ تند و تیز ہو اور نہ انتہائی سست ہو۔ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ موج سے مراد وہ لہر ہے جو پانی سے اٹھتی ہے۔ وَّظَنُّوْٓا یعنی وہ یقین کر لیں۔ اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ کہ انہیں مصیبت اور آزمائش نے گھیر لیا ہے۔ جو کوئی کسی مصیبت اور آزمائش میں واقع ہو جائے تو کہا جاتا ہے: قد أحیط بہ گویا آزمائش اور مصیبت نے اسے گھیر لیا ہے۔ اور اس کی اصل یہ ہے کہ دشمن جب کسی جگہ کو گھیر لے اور وہاں کے رہنے والے ہلاک ہو جائیں۔ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ یعنی اس وقت صرف اکیلے اسی کو پکارتے ہیں اور انہیں چھوڑ دیتے ہیں جن کی پرستش کر رہے ہوتے ہیں۔ اس میں اس پر دلیل ہے کہ مخلوق کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے کہ وہ شدائد اور مصائب میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتی ہے اور یہ کہ مضطر (مجبور محض) کی دعا کو قبول کر لیا جاتا ہے اگرچہ وہ کافر ہو، اس لیے کہ اس کے اسباب ختم ہو چکے ہیں اور اس نے وحدہ لاشریک رب الارباب کی طرف رجوع کر لیا ہے، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النمل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے: بے شک انہوں نے اپنی دعا میں أھیا شر اھیا یعنی یا حی یا قیوم کہا ہے۔ اور یہ عجم کی لغت ہے۔

مسئلہ: یہ آیت مطلق سمندر میں سوار ہونے پر دلالت کرتی ہے اور سنت سے ثابت ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 117

میں ہے: بے شک ہم سمندر میں سوار ہوتے ہیں اور اپنے ساتھ تھوڑا سا پانی بھی اٹھا لیتے ہیں (1) ...الحدیث۔ اور ام حرام کے قصہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث جنگ کے دوران سمندر میں سوار ہونے کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ یہ مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور سورۂ اعراف کے آخر میں سمندر کے موجیں مارنے اور اس میں طوفان آنے کی حالت میں اس میں سوار ہونے والے کا حکم گزر چکا ہے کیا اس کا حکم تندرست آدمی کا حکم ہے یا اس مریض کا جس کو روک دیا گیا ہے؟ وہاں اس میں غور کرلو۔

قولہ تعالیٰ: لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ اگر تو ہمیں بچالے اس شدید طوفان اور ہولنا کی سے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس ہوا سے۔ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ تو ہم یقیناً اس نجات اور خلاصی پانے کی نعمت پر شکر بجالاتے ہوئے تیری اطاعت و فرمانبرداری میں عمل کرنے والوں میں سے ہوجائیں گے۔ فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ پس جب وہ انہیں بچالیتا ہے اور خلاصی عطا فرمادیتا ہے۔ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ تو پھر وہ زمین میں فساد اور معاصی کا عمل ہی کرتے ہیں۔ اور البغی کا معنی فساد اور شرک ہے: یہ بغی الجرح سے ہے جب زخم فاسد اور خراب ہوجائے۔ اس کا اصل معنی طلب ہے یعنی وہ فساد برپا کر کے غلبہ چاہتے ہیں۔ بِغَيْرِ الْحَقِّ یعنی جھٹلانے کے ساتھ۔ اور اسی سے بغت المرأۃ ہے جب عورت خاوند کے سوا کسی اور کی خواہش کرے (یعنی زنا کا ارتکاب کرے)

قولہ تعالیٰ: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ یعنی اس کا وبال تم پر ہی لوٹ کر آئے گا۔ یہاں کلام مکمل ہوگئی۔ پھر کلام کا آغاز کیا اور فرمایا: مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی یہ دنیوی زندگی کا ساز و سامان ہے، اس کے لیے کوئی بقا نہیں ہے۔ نحاس نے کہا ہے: بَغْيُكُمْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور اس کی خبر مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ہے اور عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ، البغی کے فعل کے معنی کا مفعول ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کی خبر عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ہو اور مبتدا مضمر ہو یعنی ذالك متاع الحیاۃ الدنیا یا ھو متاع الحیاۃ الدنیا اور دونوں معنوں کے درمیان انتہائی لطیف اور باریک سا فرق ہے۔ جب تو متاع کو بَغْيُكُمْ کی خبر ہونے کی وجہ سے رفع دے تو معنی یہ ہوگا: بے شک تم میں سے بعض کا وبال بعض پر پڑے گا، مثلاً فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ (النور: 61) (تم سلامتی کی دعا دو اپنوں کو) اور اسی طرح لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (التوبہ: 128) (بے شک تشریف لایا ہے تمہارے پاس ایک برگزیدہ رسول تم میں سے) اور جب خبر عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ہو تو معنی ہوگا بے شک تمہارا فساد تمہیں پر لوٹے گا۔ جیسا کہ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (الاسراء: 7)

سفیان بن عیینہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ارادہ یہ کیا ہے کہ فساد دنیوی زندگی کا ساز و سامان ہے، یعنی اس کی سزا دنیا میں اس کے مالک کے لیے جلدی آتی ہے، جیسے کہا جاتا ہے: البغی مصرعۃ (فساد تو پچھاڑ ہے) اور ابن ابی اسحاق نے متاع کو منصوب پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ مصدر ہے، یعنی تم دنیوی زندگی سے انتہائی لطف اندوز ہوتے ہو یا پھر حرف جر کے حذف کی وجہ سے منصوب ہے اصل میں لمتاع تھا یا یہ مصدر ہے اور حال ہونے کی بنا پر بمعنی مفعول ہے، ای متمتعین یا یہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1048

ظرف کی بنا پر منصوب ہے، یعنی فی متاع الحیاۃ الدنیا اور ظرف، جار مجرور اور حال کا متعلق البغی میں فعل کا معنی ہے اور علیٰ اَنۡفُسِكُمۡ اس معنی کا مفعول ہے۔

اِنَّمَا مَثَلُ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ مِمَّا یَاۡكُلُ النَّاسُ وَ الۡاَنۡعَامُ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَخَذَتِ الۡاَرۡضُ زُخۡرُفَهَا وَ ازَّیَّنَتۡ وَ ظَنَّ اَهۡلُهَاۤ اَنَّهُمۡ قٰدِرُوۡنَ عَلَیۡهَاۤ ۙ اَتٰىهَاۤ اَمۡرُنَا لَیۡلًا اَوۡ نَهَارًا فَجَعَلۡنٰهَا حَصِیۡدًا كَاَنۡ لَّمۡ تَغۡنَ بِالۡاَمۡسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۲۴﴾

''پس حیات دنیوی (کے عروج وزوال) کی مثال ایسی ہے جیسے ہم نے پانی اتارا آسمان سے سو گھنی ہو کر اگی پانی کے باعث سرسبزی زمین کی جس سے انسان بھی کھاتے ہیں اور حیوان بھی یہاں تک کہ جب لے لیا زمین نے اپنا سنگار اور وہ خوب آراستہ ہوگئی اور یقین کر لیا اس کے مالکوں نے کہ (اب) انہوں نے قابو پالیا ہے اس پر (تو اچانک) آپڑا اس پر ہمارا حکم (عذاب) رات یا دن کے وقت پس ہم نے کاٹ کر رکھ دیا اسے گویا کل وہ یہاں تھی ہی نہیں، یونہی ہم وضاحت سے بیان کرتے ہیں (اپنی قدرت کی) نشانیوں کو اس قوم کے لیے جو غور وفکر کرتی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا مَثَلُ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ آیت کے معنی میں تشبیہ اور تمثیل ہے، یعنی دنیوی زندگی اپنے فناء ہونے، زوال پذیر ہونے، اپنے رتبہ کے کم ہونے اور اس پر فخر کرنے کے اعتبار سے پانی کی مثل ہے، پس آیت میں کاف رفع کے محل میں ہے۔ اس تشبیہ کا مزید بیان سورۃ الکہف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ یہ ماکی صفت ہے۔ فَاخۡتَلَطَ حضرت نافع سے روایت ہے کہ انہوں نے فَاخۡتَلَطَ پر وقف کیا ہے یعنی پانی زمین کے ساتھ مل گیا، پھر ابتدا کی۔ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ یعنی پانی کے ساتھ زمین کی سرسبزی ہے۔ پس زمین نے طرح طرح کی نباتات نکالیں پس اس بنا پر نبات مبتدا ہے اور اس کے مذہب کے مطابق جنہوں نے فَاخۡتَلَطَ پر وقف نہیں کیا نبات اختلط کے سبب مرفوع ہے یعنی نباتات بارش کے ساتھ مل گئیں یعنی نباتات بارش سے سیراب ہوئیں اور نمی حاصل کی، خوبصورت ہوئی اور خوب سرسبز وشاداب ہو کر اگی اور اختلاط کا معنی ہوتا ہے ایک چیز کا آپس میں ایک دوسرے کے اندر داخل ہو جانا۔

قولہ تعالیٰ: وَمِمَّا یَاۡكُلُ النَّاسُ جس سے انسان بھی کھاتے ہیں مثلاً دانے (اناج) پھل اور سبزیاں وَالۡاَنۡعَامُ اور حیوان بھی، مثلاً گھاس، بھوسہ اور جو وغیرہ۔ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَخَذَتِ الۡاَرۡضُ زُخۡرُفَهَا یہاں تک کہ جس زمین نے اپنا حسن اور اپنا سنگار لے لیا۔ اور الزخرف کا معنی ہے کسی شے کا حسن وکمال۔ اور اسی وجہ سے سونے کو بھی زخرف کہا گیا ہے۔ وَازَّیَّنَتۡ یعنی وہ دانوں، پھلوں اور پھولوں کے ساتھ خوب آراستہ ہوگئی۔ یہ لفظ اصل میں تزینت ہے اس میں تا کو زا میں ادغام کیا گیا ہے اور ابتدا میں ہمزہ وصل لایا گیا ہے، کیونکہ حرف مدغم قائم مقام دو حرفوں کے ہوتا ہے ان میں سے پہلا ساکن ہوتا ہے اور ساکن

سے ابتدا ممکن نہیں ہوتی۔ اور حضرت ابن مسعود اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما نے وتزینت اصل کے مطابق پڑھا ہے۔ اور حسن، اعرج اور ابوالعالیہ نے وازینت پڑھا ہے یعنی غلہ اور کھیتی اس پر زینت اور سنگار لائی۔ اور یہ فعل کو اپنے اصل کے مطابق لائے ہیں اگرچہ اس کی تعلیل کی ہے اور کہا ہے: وازانت۔ اور عوف بن ابی جمیلہ اعرابی نے کہا ہے: ہمارے اشیاخ نے واز یانت پڑھا ہے اس کا وزن اسوادت ہے۔ اور مقدمی کی روایت میں واڈاینت ہے اور اس میں اصل تزاینت ہے، اس کا وزن تفاعست ہے پھر اس میں اوغام کیا گیا ہے۔ اور حضرت شعبی اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہما نے وأزینت، أفعلت کی مثل پڑھا ہے۔ اور ابو عثمان نہدی نے وازْیَنّت، أفعلت کی مثل پڑھا ہے۔ اور ان سے وازیانت، أفعالت کی مثل بھی ہے اور ان سے ازیانت ہمزہ کے ساتھ بھی مروی ہے، یہ تین قراءتیں ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَ ظَنَّ اَهْلُهَاۤ اور اس کے مالکوں نے یقین کرلیا۔ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْهَاۤ کہ اب وہ اس کے کاٹنے اور اس سے نفع اٹھانے پر قادر ہیں۔ زمین کے بارے خبر دی ہے اور اس سے مقصود نباتات ہے جب اس کو سمجھا گیا اور وہ اسی سے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ضمیر غلہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ زینت کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا تو اس پر اچانک ہمارا عذاب آپڑا یا اسے ہلاک کرنے کے بارے ہمارا حکم آپڑا۔ لَیْلًا اَوْ نَهَارًا یہ دونوں ظرفیں ہیں۔ فَجَعَلْنٰهَا حَصِیْدًا یہ دو مفعول ہیں، یعنی پس ہم نے اسے کٹا ہوا بنادیا (گویا) اس میں کوئی شے نہ تھی اور فرمایا: حَصِیْدًا اور اسے مونث ذکر نہ کیا گیا کیونکہ یہ فعیل بمعنی مفعول ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: الحصید کا معنی مستاصل جڑ سے کٹا ہوا ہے۔ كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ یعنی گویا کہ وہ کل آباد نہ تھی، یہ غنی سے ہے جب کوئی کسی جگہ مقیم ہو اور اسے آباد کرے۔ اور لغت میں مغانی سے مراد وہ منازل (گھر) ہیں جنہیں لوگ آباد کرتے ہیں۔ اور حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: گویا وہ خوشگوار اور سرسبز ہوئی ہی نہیں۔ لبید نے کہا ہے:

وغَنِيتُ سَبْتًا قبل مَجْرَى داحس لو كان للنفس اللَّجُوجِ خلودُ(1)

عام قراءت تغن تا کے ساتھ ہے، کیونکہ الارض مونث ہے۔ اور حضرت قتادہ نے یغن یاء کے ساتھ قراءت کی ہے اور یہ اس کی نسبت زخرف کی طرف کرتے ہیں، یعنی جس طرح وہ اس کھیتی کو ہلاک کرسکتا ہے اسی طرح وہ دنیا کو بھی ہلاک و برباد کر دے گا۔ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ یعنی ہم نشانیاں اور علامات بیان کرتے ہیں۔ لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ اس قوم کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی آیات میں غور و فکر کرتے ہیں۔

وَ اللّٰهُ یَدْعُوْۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝۲۵

''اور اللہ تعالیٰ بلاتا ہے (امن و) سلامتی کے گھر کی طرف۔ اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اللّٰهُ یَدْعُوْۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ جب اللہ تعالیٰ اس دار یعنی دار دنیا کا وصف ذکر کر چکا تو اس نے آخرت کا وصف

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 431-430

بیان فرمایا اور کہا: بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں دنیا جمع کرنے کی طرف دعوت نہیں دیتا بلکہ وہ تمہیں طاعت کی طرف بلاتا ہے تاکہ تم دار السلام یعنی جنت کے اہل ہو جاؤ۔ حضرت قتادہ اور حسن نے فرمایا: السلام تو خود اللہ تعالیٰ ہے اور اس کا دار جنت ہے (1)۔ اور جنت کو دار السلام کا نام دیا گیا ہے کیونکہ جو اس میں داخل ہو گیا وہ آفات سے محفوظ و مامون ہو جائے گا۔ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء میں سے ''السلام'' ہے، تحقیق ہم نے اسے ''الکتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ'' میں بیان کیا ہے اور اس کا ذکر سورۃ الحشر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اور اللہ تعالیٰ امن و سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ اور السلام اور السلامۃ ایک ہی معنی میں ہیں جیسے الرضاع اور الرضاعۃ ہیں۔ یہ زجاج نے کہا ہے۔ شاعر کا قول ہے:

تُحیيِّ بالسلامة أُمُّ بکرٍ وهل لكِ بعد قومِك من سلام

اور کہا گیا ہے: مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دار التحیہ کی طرف بلاتا ہے، کیونکہ اس کے باسی اللہ تعالیٰ کی جانب سے تحیہ اور سلام پائیں گے اور اسی طرح ملائکہ کی طرف سے بھی (سلام پائیں گے)۔ حسن نے کہا ہے: بے شک اہل جنت سے سلام منقطع نہ ہوگا اور یہ ان کا تحیہ ہے، جیسا کہ فرمایا: وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ (یونس: 10) اور ان کی دعا یہ ہوگی کہ ''سلامتی ہو'' اور یحییٰ بن معاذ نے کہا ہے: اے ابن آدم! اللہ تعالیٰ تجھے دار السلام کی طرف بلا رہا ہے سو تو دیکھ ہم اسے کہاں سے جواب دے رہے ہیں۔ پس اگر تو نے اسے اپنی دنیا سے جواب دیا تو تو اس میں داخل ہو جائے گا اور اگر تو نے اسے اپنی قبر سے جواب دیا تو تو اس سے روک دیا جائے گا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جنتیں سات ہیں: دار الجلال، دار السلام، جنت عدن، جنۃ الماویٰ، جنۃ الخلد، جنۃ الفردوس اور جنۃ النعیم۔

قولہ تعالیٰ: وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ اپنی حجت کے اظہار کے لیے دعوت کو عام کیا اور اپنی مخلوق سے استغنا برتتے ہوئے ہدایت کو خاص کر دیا۔ اور صراط مستقیم کے بارے کہا گیا ہے کہ مراد کتاب اللہ ہے (2)۔ اسے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''صراط مستقیم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے''۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اسلام ہے۔ اسے نواس بن سمعان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد حق ہے۔ یہ حضرت قتادہ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آپ کے دونوں صحابی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن باہر تشریف لائے اور فرمایا: ''میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام میرے سر کے پاس اور حضرت میکائیل علیہ السلام میرے پاؤں کے پاس کھڑے ہیں تو ان میں سے ایک نے اپنے دوسرے ساتھی کو کہا: ان کی مثال بیان کیجئے، تو اس نے اسے کہا: تو سن تیرے کان سنیں اور اپنے دل کی عقل کے ساتھ اسے سمجھ بلاشبہ تیری اور تیری امت کی مثال اس بادشاہ کی مثل ہے جس کا ایک دار ہو پھر وہ اس میں گھر بنائے

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 121

2۔ جامع ترمذی، فضائل القرآن، جلد 2، صفحہ 114، (مفہوم)

پھر اس میں ایک دعوت کا اہتمام کرے پھر وہ ایک قاصد بھیجے جو لوگوں کو اس کے کھانے کی دعوت دے پس ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اس قاصد کی دعوت کو قبول کیا اور بعض وہ ہیں جنہوں نے اسے چھوڑ دیا، پس اللہ تعالیٰ وہ بادشاہ ہے اور وہ دار السلام ہے اور وہ بیت (گھر) جنت ہے اور اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ وہ قاصد اور رسول ہیں پس جس نے آپ کی دعوت کو قبول کر لیا وہ اسلام میں داخل ہو گیا اور جو اسلام میں داخل ہو گیا وہ جنت میں داخل ہو گا اور جو جنت میں داخل ہو گا وہ اس سے کھائے گا جو کچھ (اللہ تعالیٰ کی نعمتیں) اس میں ہیں" (1)۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ تلاوت فرمائی۔ پھر حضرت قتادہ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہما نے یہ آیت تلاوت کی وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ اور یہ آیت قدریہ کے خلاف ان کے رد میں واضح اور بین دلیل ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت دی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے: وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ پس انہوں نے اللہ تعالیٰ پر نصوص قرآن کو واپس لوٹا دیا (اور انہیں قبول نہ کیا)

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ ؕ وَ لَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّ لَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۶

"ان کے لیے جنہوں نے نیک عمل کیے نیک جزا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے اور نہ چھائے گا ان کے چہروں پر (رسوائی کا) غبار اور نہ ذلت (کا اثر ہو گا)، یہی لوگ جنتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

قولہ تعالیٰ: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قول باری تعالیٰ وزیادۃ کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: للذین أحسنوا العمل فی الدنیا لهم الحُسنیٰ وهی الجنة والزیادة النظر الی وجه الله الکریم (2) (ان کے لیے جنہوں نے دنیا میں نیک عمل کیے ان کے لیے نیک جزا ہے اور وہ جنت ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے اور وہ اللہ کریم کے چہرہ قدرت کا دیدار ہے) یہی قول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت ہے۔ اور حضرت حذیفہ، حضرت عبادہ بن صامت، حضرت کعب بن عجرہ، حضرت ابوموسیٰ، حضرت صہیب رضی اللہ عنہم اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں ہے اور یہی تابعین کی جماعت کا قول ہے اور یہی اس باب میں صحیح ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے، آپ نے فرمایا: "جب اہل جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: تم کوئی چیز چاہتے ہو میں تمہارے لیے اس کا اضافہ کر دوں، تو وہ عرض کریں گے: کیا تو نے ہمارے چہروں کو روشن نہیں کر دیا، کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا اور ہمیں جہنم سے نجات عطا فرما دی؟ آپ نے فرمایا: پس اللہ تعالیٰ حجاب اٹھا دے گا پھر انہیں کوئی چیز عطا نہیں کی گئی جو اس کے نزدیک اپنے رب کریم کے دیدار سے زیادہ محبوب ہو" (3)۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الامثال، جلد 2، صفحہ 109۔ ایضاً، حدیث نمبر 2787، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 115 3۔ جامع ترمذی، کتاب الامثال، جلد 2، صفحہ 535

اور ایک روایت میں ہے: پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ اور اسے نسائی نے بھی حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کی گئی: یہ آیت لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب اہل جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے اور اہل جہنم جہنم میں داخل ہو جائیں گے تو ایک ندا دینے والا پکارے گا: اے اہل جنت! بے شک تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک وعدہ ہے وہ چاہتا ہے کہ اسے تمہارے لیے پورا کر دے تو وہ کہیں گے: کیا اس نے ہمارے چہروں کو روشن نہیں کر دیا اور ہمارے میزانوں کو بھاری نہیں کر دیا اور ہمیں جہنم سے نجات عطا نہیں فرمادی؟ آپ نے فرمایا: پس وہ حجاب اٹھا دے گا اور وہ اس کی طرف دیکھنے لگیں گے پھر قسم بخدا! اللہ کریم نے انہیں کوئی چیز عطا نہیں فرمائی جو ان کے نزدیک اس رؤیت سے زیادہ محبوب ہو اور ان کی آنکھوں کو زیادہ ٹھنڈا کرنے والی ہو'' (1)۔

اور اسے ابن المبارک نے اپنے دقائق میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے موقوف روایت کیا ہے اور ہم نے اسے کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے اور ہم نے وہاں کشف الحجاب کا معنی بھی ذکر کیا ہے۔ والحمد للہ۔ اور ترمذی حکیم ابو عبداللہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ ہمیں علی بن حجر نے بیان کیا (انہوں نے کہا) ہمیں ولید بن مسلم نے زہیر سے اور انہوں نے ابو العالیہ سے اور انہوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے دو زیادتیوں کے بارے پوچھا جن کا ذکر کتاب اللہ میں ہے۔ ایک اس قول میں لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ تو آپ ﷺ نے فرمایا: النظر إلى وجه الرحمن (2) (رحمٰن کے چہرہ قدرت کا دیدار کرنا) اور دوسرا اس ارشاد میں: وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۞ (الصافات) تو آپ نے فرمایا: ''(اس سے مراد) بیس ہزار ہیں''۔

تحقیق یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک زیادۃ سے مراد یہ ہے کہ ایک نیکی کی جزا کو دس نیکیوں سے لے کر اس سے زیادہ گنا تک کر دیا جائے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ زیادۃ ایک موتی سے بنا ہوا کمرہ ہے جس کے چار ہزار دروازے ہیں۔ اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: الحسنیٰ سے مراد نیکی کی مثل نیکی ہے، اور زیادۃ سے مراد اللہ تعالیٰ کی جانب سے مغفرت اور رضامندی کا حاصل ہونا ہے (3)۔ اور عبدالرحمن بن زید بن اسلم نے کہا ہے: الحسنیٰ سے مراد جنت ہے، اور زیادۃ سے مراد وہ افضل ہے جو دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا اور قیامت کے دن وہ اس کے بارے ان کا محاسبہ نہیں کرے گا (4)۔ اور عبدالرحمن بن سابط نے کہا ہے: الحسنیٰ سے مراد بشارت اور خوشخبری ہے اور زیادۃ سے مراد رب کریم کے چہرہ قدرت کی طرف دیکھنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۞ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۞ (القیامہ)

اور یزید بن شجرہ نے کہا ہے: زیادۃ یہ ہے کہ اہل جنت کے پاس سے ایک بادل گزرے گا اور وہ ان پر ایسی تمام نادر

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 137 — 2۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 198

3۔ ایضاً، جلد 11، صفحہ 126 — 4۔ ایضاً

نعمتیں برسائے گا جو انہوں نے نہ دیکھی ہوں گی اور وہ کہے گا: اے اہل جنت! کیا تم کوئی شے چاہتے ہو کہ میں تم پر اسے برسا دوں؟ پس وہ جو بھی خواہش کریں گے وہ ان پر اسے برسا دے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: زیادۃ یہ ہے کہ ان پر ایام دنیا میں سے ایک دن کی مقدار بھی نہیں گزرے گی مگر یہ کہ ان میں سے ہر ایک گھر کا ستر ہزار فرشتے طواف کر لیں، ہر فرشتے کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسے تحائف اور ہدایا ہوں گے جو اس کے ساتھی فرشتے کے پاس نہ ہوں گے اور انہوں (اہل جنت) نے ان ہدایا کی مثل کبھی نہ دیکھے ہوں گے، پس پاک ہے وہ جو الواسع، العلیم، الغنی، الحمید، العلی، الکبیر، العزیز، القدیر، البر، الرحیم، المدبر، الحکیم اور اللطیف، الکریم ہے جس کی مقدورات لامتناہی اور لامحدود ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: أحسنوا جنہوں نے لوگوں کے ساتھ معاملہ نیکی اور اچھائی کے ساتھ کیا۔ اور الحسنیٰ ان کے لیے شفاعت ہے اور زیادۃ سے مراد اللہ تعالیٰ کا اس (شفاعت) کی اجازت دینا اور اسے قبول کرنا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا يَرْهَقُ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے یلحق (اور لاحق نہ ہوگا) اور اسی معنی میں کہا گیا ہے: غلام مرھق جب بچہ (بالغ ہونے کے قریب پہنچ کر) مردوں کے ساتھ مل جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے یعلو (بلند ہونا، غالب ہونا)۔ اور بعض نے کہا ہے: یغشی (ڈھانپ لینا) یہ معنوی اعتبار سے آپس میں قریب قریب ہیں۔ قتر اس کا معنی ہے غبار۔ ولا ذلة اور نہ ذلت و رسوائی، جیسا کہ اہل جہنم کو لاحق ہوگی، یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب انہیں اٹھائے جانے کے وقت غبار انہیں لاحق نہیں ہوگا اور نہ ذلت و رسوائی انہیں ڈھانپے گی۔ ابو عبیدہ نے فرزدق کا یہ شعر بیان کیا ہے:

مُتَوَّجٌ بِرداء الملك يتبعه موج ترى فوقه الراياتِ والقَتَرا(1)

حسن نے قتْرًا کو ساکن پڑھا ہے۔ اور القتَر و القتَرة و القتْر تمام ایک ہی معنی میں ہیں۔ یہ نحاس نے کہا ہے۔ اور القتَر کی واحد قتَرة ہے۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۞ (عبس) یعنی ان پر گرد و غبار غالب یعنی چھایا ہوگا اور یہ بھی کہا گیا ہے: قتر کا معنی غمزدہ ہونا اور حالت کا خراب ہونا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: القتر سے مراد چہروں کا سیاہ ہونا ہے۔ ابن بحر نے کہا ہے: اس سے مراد آگ کا دھواں ہے۔ اور اسی سے قتار القدر (ہنڈیا کی بھاپ) ہے۔ اور ابن ابی لیلیٰ نے کہا ہے: یہ ان کا اپنے رب کے دیدار سے محروم رہنا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ محل نظر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۞ تا قولہ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ (الانبیاء) (بلاشبہ وہ لوگ جن کے لیے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی، تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے نہ غمناک کرے گی انہیں وہ بڑی گھبراہٹ)

اور دوسری آیت میں فرمایا: لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۞ (یونس) (اور نہیں کوئی اندیشہ ان کے لیے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اور مزید فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا، الآیہ (حم

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 433

السجدہ:30) (بے شک وہ (سعادت مند) جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے پھر وہ اس قوم پر پختگی سے قائم رہے اترتے ہیں ان پر فرشتے (اور انہیں کہتے ہیں) کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو)۔ اور یہ عام ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ نیکی کرنے والے کا چہرہ غم واندوہ کی سیاہی کے ساتھ کسی مقام میں بھی متغیر اور تبدیل نہیں ہوگا نہ دیدار الٰہی سے پہلے اور نہ اس کے بعد اور جہنم وغیرہ کے دھوئیں میں سے کوئی شے اس پر غالب نہیں آئے گی۔ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (آل عمران) (اور وہ (خوش نصیب) لوگ روشن ہوں گے جن کے چہرے تو وہ رحمت الٰہی (کے سائے) میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے)

وَ الَّذِیْنَ كَسَبُوا السَّیِّاٰتِ جَزَآءُ سَیِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا ۙ وَ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَاۤ اُغْشِیَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّیْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''اور جنہوں نے برے کام کیے تو برائی کی سزا اس جیسی ہوگی اور چھا رہی ہوگی ان پر ذلت، نہیں ہوگا ان کے لیے اللہ (کے عذاب) سے کوئی بچانے والا گویا ڈھانپ دیئے گئے ہیں ان کے چہرے کالی رات کے کسی ٹکڑے سے، وہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ الَّذِیْنَ كَسَبُوا السَّیِّاٰتِ اور جنہوں نے گناہ کے اعمال کیے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد شرک ہے (یعنی جنہوں نے شرک کیا) جَزَآءُ سَیِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا، جَزَآءُ یہ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور اس کی خبر بِمِثْلِهَا ہے۔ ابن کیسان نے کہا ہے: اس میں با زائدہ ہے اور اس کا معنی ہے جَزَآءُ سَیِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا (برائی کی سزا اس کی مثل ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: با اپنے مابعد سمیت خبر ہے اور یہ محذوف کے متعلق ہے اور یہ اس کے قائم مقام ہے اور اس کا معنی ہے: جزاء سیئة کائن بمثلها (برائی کی سزا اسی جیسی ہوگی) جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: إنما أنا بك یعنی إنما انا کائن بك اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ جزا کے متعلق ہو، تقدیر کلام ہو: جزاء سیئة بمثلها کائن پھر مبتدا کی خبر حذف کر دی گئی۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ جزاء مرفوع ہو اور تقدیر کلام یہ ہو فلهم جزاء سیئة پس یہ اس قول کی مثل ہو جائے گا: فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ (البقرہ:185) یعنی فعلیه عدة اور اس کے مشابہ کوئی شے۔ اور اس تقدیر کے مطابق با محذوف کے متعلق ہوگی، گویا کہ یہ کہا: لهم جزاء سیئة ثابت بمثلها (ان کے لیے برائی کی سزا اسی کی مثل ثابت ہے) یا پھر یہ با مؤکدہ یا زائدہ ہوگی۔

اور اس مثلیت کا معنی یہ ہے کہ وہ سزا جو شمار کی جا رہی ہے وہ ان کے گناہوں کے مماثل ہے، یعنی وہ مظلوم نہیں ہیں، ان پر کوئی زیادتی نہیں کی جا رہی۔ اور اللہ تعالیٰ کا فعل کسی علت کے ساتھ معلل نہیں ہوتا۔ وَ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ یعنی انہیں یبوست اور ذلت و رسوائی ڈھانپے ہوئے ہوگی۔ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ان کے لیے اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا جو انہیں اس سے بچائے گا۔ كَاَنَّمَاۤ اُغْشِیَتْ گویا ڈھانپ دیئے گئے ہیں۔ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا ان کے چہرے۔ قطع، قطعة کی جمع ہے اور اس بنا پر مظلما، اللیل سے حال ہوگا، یعنی ان کے چہرے ڈھانپ دیئے گئے ہیں رات کے ٹکڑے سے اس

حال میں کہ وہ تاریک اور اندھیری تھی۔

کسائی اور ابن کثیر نے قطعا طا کو ساکن پڑھا ہے۔ اور اس بنا پر مظلما صفت ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اللیل سے حال ہو۔ اور القطع نام ہے اس شے کا جس کو کاٹ دیا جائے اور وہ گر جائے۔ اور ابن السکیت نے کہا ہے: رات کا ایک حصہ اور طائفہ ہے۔ اس کا بیان سورۂ ہود میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَ شُرَكَآؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ۝۲۸

”اور (ان کی پشیمانی کا تصور کرو) جس روز ہم جمع کریں گے ان سب کو (میدان حشر میں) پھر ہم حکم دیں گے مشرکوں کو اپنی اپنی جگہ پر ٹھہر جاؤ تم اور تمہارے جھوٹے معبود، پھر ہم منقطع کر دیں گے ان کے باہمی تعلقات اور کہیں گے ان کے معبود (اے مشرکو!) تم ہماری تو عبادت نہیں کیا کرتے تھے“۔

قولہ تعالیٰ: وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ اور جس دن ہم انہیں جمع کریں گے اور حشر کا معنی جمع کرنا ہے۔ جَمِيْعًا یہ حال ہے۔ ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا پھر ہم حکم دیں گے ان کو جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنائے۔ مَكَانَكُمْ یعنی تم اپنی اپنی جگہ کو لازم پکڑو اور اسی پر ثابت قدم رہو۔ اور اپنی جگہوں پر ٹھہرے رہو۔ اَنْتُمْ وَ شُرَكَآؤُكُمْ (تم اور تمہارے جھوٹے معبود) اور یہ وعید ہے۔

فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ یعنی ہم تفریق ڈال دیں گے اور ہم اس دوستی اور تعلق کو توڑ دیں گے جو ان کے درمیان دنیا میں قائم تھا، کہا جاتا ہے: زیلتہ فتزیل، أي فرقتہ فتفرق (میں نے اسے علیحدہ کیا پس وہ علیحدہ ہو گیا) اور یہ فعلت، کیونکہ اس کے مصدر میں تو تزییلا کہتا ہے (مقصود یہ بتانا ہے کہ یہ باب تفعیل ہے) اور اگر فیعلت ہوتا تو پھر تو مصدر زیلۃ کہتا۔ اور المزایلۃ کا معنی المفارقۃ ہے: کہا جاتا ہے: زایلہ اللہ مزایلۃ و زیالا جب اللہ تعالیٰ اسے جدا اور علیحدہ کر دے۔ اور التزایل کا معنی التباین (جدا ہونا) ہے۔ فراء نے کہا ہے: بعض نے فزایلنا بینھم پڑھا ہے۔ کہا جاتا ہے: لا أزایل فلانا، ای لا أفارقہ (میں اسے جدا نہیں کروں گا) اور اگر تو کہے: لا ازادلہ تو اس کا معنی دوسرا ہے اور وہ ہے لا أخاتلہ (میں اسے فریب اور دھوکہ نہیں دوں گا)۔

وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ اس میں شرکاء سے مراد ملائکہ ہیں۔ بعض نے کہا ہے: شیاطین ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: بت ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ انہیں بولنے کی قدرت دے گا اور یہ گفتگو ان کے اپنے درمیان ہو گی۔ اور یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے ان شیاطین کے خلاف دعویٰ کیا جن کی انہوں نے اطاعت و پیروی کی اور ان بتوں کے خلاف دعویٰ کیا جن کی وہ عبادت کرتے رہے کہ انہوں نے انہیں اپنی عبادت کرنے کا حکم دیا اور وہ کہیں گے: ہم نے تمہاری عبادت نہیں کی یہاں تک کہ تم نے ہمیں حکم دیا۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ بتوں کو بولنے کی قدرت دے گا، پس وہ کہیں گے: ہم تو اس بارے شعور ہی نہیں رکھتے تھے کہ تم ہماری عبادت کر رہے ہو اور نہ ہم نے تمہیں اپنی عبادت کرنے کا حکم دیا۔ اور اگر شرکاء کو شیاطین پر محمول کیا جائے تو معنی یہ ہو گا کہ وہ مدہوش ہو کر یہ کہتے ہیں یا وہ جھوٹ اور خلاصی کا حیلہ کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں۔ اور اس کی

مثل کل جاری ہوگا، اگرچہ معارف ضروریہ اور بدیہی ہے۔

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝

''پس کافی ہے اللہ تعالیٰ گواہ ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان کہ ہم تمہاری پرستش سے بالکل بے خبر تھے''۔

قولہ تعالیٰ: فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ، شَهِيْدًا یہ مفعول ہے یعنی کفی اللہ شهيدا یا یہ تمیز ہے، یعنی اکتف به شهيدا بيننا و بينكم یعنی اللہ تعالیٰ پر اکتفا کرو بطور گواہ ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان اگر ہم نے تمہیں اس بارے حکم دیا ہے یا ہم نے اسے تم سے پسند کیا ہے (اور رضامندی کا اظہار کیا ہے) اِنْ كُنَّا یعنی ہم نہیں تھے۔ عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ تمہاری پرستش کے بارے میں بالکل بے خبر، نہ ہم سنتے تھے، نہ دیکھتے تھے اور نہ عقل رکھتے تھے، کیونکہ ہم تو جمادات تھے ہم میں روح نہ تھی۔

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّاۤ اَسْلَفَتْ وَ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝

''وہاں آزمالے گا ہر شخص جو اس نے آگے بھیجا تھا اور انہیں لوٹا دیا جائے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ان کا مالک حقیقی ہے اور گم ہو جائے گا ان سے جو وہ افترا باندھا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: هُنَالِكَ یہ ظرف ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ تَبْلُوْا یعنی اس وقت میں (آزمالے گا) تبلو بمعنی تذوق یعنی چکھ لے گا۔ اور کلبی نے کہا: بمعنی تعلم ہے یعنی ہر شخص جان لے گا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بمعنی تختبر ہے یعنی آزمالے گا۔ كُلُّ نَفْسٍ مَّاۤ اَسْلَفَتْ یعنی اس عمل کی جزا جو اس نے کیا اور آگے بھیجا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بمعنی تسلم (وہ حوالے کردے گا) یعنی حقوق میں سے جو اس پر تھے وہ ان کو ان کے مالکوں کے حوالے کر دے گا ان کے اختیار اور ان کی پسند کے بغیر۔ اور حمزہ اور کسائی نے تتلوا پڑھا ہے یعنی ہر نفس اپنے اس نامہ عمل کو پڑھ لے گا جو اس میں لکھا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تتلوا بمعنی تتبع ہے یعنی ہر نفس اس کی اتباع کرے گا جو اس نے دنیا میں آگے بھیجا۔ یہ سدی نے کہا ہے۔ اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

إن المريب يتبع المريبا　　كما رأيت الذيب يتلو الذيبا(1)

قولہ تعالیٰ: وَ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ، الْحَقِّ بدل یا صفت ہونے کی بنا پر مجرور ہے۔ اور حق کو نصب دینا بھی جائز ہے اس کی تین وجوہ ہو سکتی ہیں: تقدیر کلام ہو: و ردوا حقا (اور انہیں لوٹا دیا جائے گا حق) پھر اسے الف لام کے ساتھ لایا گیا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہو: مولاهم حقا لا ما يعبدون من دونه (جو ان کا مالک ہے از روئے حقیقت کے نہ کہ وہ جن کی وہ اس کے سوا عبادت کرتے ہیں)۔ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ بطور مدح کے منصوب ہو أي أعني الحق (میری مراد حق ہے) اور یہ بھی جائز ہے کہ الحق کو رفع دیا جائے۔ اس صورت میں معنی ہوگا: مولاهم الحق یہ مبتدا اور خبر ہوگا

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 434

اور ماقبل سے منقطع ہوگا۔ (اللہ ان کا حقیقی مالک ہے) نہ کہ وہ جن کو وہ اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے بالحق کے ساتھ اپنا وصف بیان کیا ہے کیونکہ حق اسی کی طرف سے ہوتا ہے جیسا کہ اس نے اپنی ذات کو عدل کے ساتھ متصف کیا ہے کیونکہ عدل اسی سے ہوتا ہے۔ یعنی ہر عدل اور حق وہ اسی کی طرف سے ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ یعنی وہ جو انہیں حق کے ساتھ جزا دے گا۔ وَضَلَّ عَنْهُمْ یعنی باطل ہے۔

مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ، يَفْتَرُوْنَ محل رفع میں ہے اور یہ مصدر کے معنی میں ہے، أي افتراؤهم (یعنی ان کا افتراء، باندھنا باطل ہے) پس اگر کہا جائے: کیسے یہ کہا: وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ حالانکہ خبر یہ دی گئی ہے کہ کافروں کا کوئی مولیٰ نہیں؟ تو جواباً یہ کہا جائے گا: ان کے لیے مدد و نصرت کرنے کا کوئی مالک نہیں اور وہ رزق اور نعمتیں عطا کرنے میں تو ان کا مولیٰ ہے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝

''آپ پوچھیے کون رزق دیتا ہے تمہیں آسمان اور زمین سے یا کون مالک ہے کان اور آنکھ کا اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور (کون) نکالتا ہے مردہ کو زمین سے اور کون ہے جو انتظام فرماتا ہے ہر کام کا؟ تو وہ (جواباً) کہیں گے: اللہ! پس آپ کہیے: (جب حقیقت یہ ہے) تو تم (شرک سے) کیوں نہیں بچتے''۔

اس کلام کو چلانے کا مقصد مشرکوں کا رد ہے اور ان کے خلاف حجت کو پختہ کرنا ہے۔ پس جنہوں نے ان میں سے اعتراف کر لیا تو ان پر تو حجت بالکل ظاہر ہے اور جنہوں نے اعتراف نہیں کیا تو ان پر اسے پختہ اور مضبوط کیا کہ یہ آسمان اور زمین ہیں ان دونوں کے لیے خالق کا ہونا ضروری اور لازمی ہے۔ اور کوئی عقل مند اس میں شک نہیں کر سکتا۔ اور یہ مرتبہ ضرورت کے بالکل قریب ہے۔

مِّنَ السَّمَآءِ یعنی بارش کے ساتھ۔ وَالْاَرْضِ یعنی زمین سے اگنے والے اناج کے ساتھ (1)۔ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ یعنی کون ہے جس نے ان دونوں (کان اور آنکھ) کو بنایا ہے اور انہیں تمہارے لیے پیدا کیا ہے؟ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ یعنی کون ہے جو نباتات کو زمین سے اور انسان کو نطفہ سے اور کھیتی (کی) بالی کو دانے سے، پرندے کو انڈے سے اور مومن کو کافر سے نکالتا ہے؟ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ یعنی کون ہے جو امور کو مقرر کرتا ہے اور ان کا فیصلہ کرتا ہے؟ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ (تو وہ (جواباً) کہیں گے: اللہ، کیونکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے یا وہ کہیں گے: وہ اللہ ہی ہے اگر وہ غور و فکر کریں اور انصاف سے کام لیں۔ فَقُلْ، اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں فرمائیے۔ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ یعنی کیا وہ دنیا اور آخرت میں اس کی سزا اور اس کے عذاب سے ڈرتے نہیں؟

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 117

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۳۲

''یہ ہے اللہ جو تمہارا حقیقی پروردگار ہے، پس حق کے بعد کیا ہے بجز گمراہی کے، پھر تمہیں (حق سے) کدھر موڑا جا رہا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ یعنی وہ جو اس قسم کے کام کرتا ہے وہ تمہارا حقیقی پروردگار ہے، نہ کہ وہ جنہیں تم اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو۔ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ، ذا صلہ ہے أی ما بعد عبادة الإله الحق إذا ترکت عبادته إلا الضلال (یعنی الہ حقیقی کی عبادت کے بعد جب تو اس کی عبادت کو چھوڑ دے گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہے) اور بعض متقدمین نے کہا ہے: اس آیت کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد جو ہے وہ گمراہی ہے، کیونکہ اس کا اول حصہ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ہے اور آیت کا آخر فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ہے پس یہ ایمان اور کفر کے بارے میں ہے، اعمال کے بارے میں نہیں ہے۔ اور بعض نے کہا: بے شک کفر حق کو ڈھانپ دیتا ہے اور ہر وہ جو حق کے سوا ہے وہ اس کے قائم مقام ہوگا، پس حرام گمراہی ہے اور مباح ہدایت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی مباح کرنے والا اور حرام کرنے والا ہے۔ صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ پہلے فرمایا: قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ پھر فرمایا: فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ یعنی یہ ہے وہ جو تمہیں رزق دیتا ہے اور یہ سب اس کا فعل ہے۔ رَبُّكُمُ الْحَقُّ وہی تمہارا حقیقی پروردگار ہے الوہیت جس کا حق ہے اور اس کی عبادت واجب ہے اور جب صورت حال یہ ہے تو پھر کسی اور کا شریک ٹھہرانا گمراہی اور غیر حق ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اس آیت نے یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ حق اور باطل کے درمیان کوئی تیسری منزل نہیں یہ اس مسئلہ میں ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید کے بارے ہے اور اس کی نظائر میں بھی حکم اسی طرح ہے اور یہ ان اصولی مسائل میں سے ہے جن میں ایک طرف میں حق ہے، کیونکہ کلام اسی میں ہے بلاشبہ وہ وجود ذات کے بیان میں ہے کہ وہ کیسے ہے اور یہ ان فروعی مسائل کے خلاف ہے جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (المائدہ: 48) (ہر ایک کے لیے بنائی ہے ہم نے تم میں سے ایک شریعت اور عمل کی راہ)

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''حلال بین اور واضح ہے اور حرام بھی بین اور واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان امور متشابہات ہیں'' (1)۔ اور کلام فروع کے بارے ہے اور بلاشبہ یہ ایسے احکام کے بارے ہے جو طاری ہوتے ہیں ایسے پختہ اور مضبوط اصول پر جن میں کوئی اختلاف نہیں کیا جاتا بلکہ ان سے متعلقہ احکام میں اختلاف کیا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کے وسط میں نماز کے لیے قیام فرما ہوتے تو کہتے: ''اے اللہ تیرے لیے ہی حمد ہے'' الحدیث۔ اور اس میں یہ ہے ''تو حق ہے اور تیرا وعدہ حق ہے اور تیرا قول حق ہے اور تیری ملاقات حق ہے اور جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے اور قیامت حق ہے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 13

اور انبیاء حق ہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) حق ہیں" (1) الحدیث۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول: انت الحق اس کا معنی ہے تو واجب الوجود ہے۔ اور اس کی اصل حق الشیء سے ہے، یعنی جب کوئی شے ثابت اور واجب ہو جائے۔ حقیقی طور پر یہ وصف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے کیونکہ اس کا وجود اپنا ذاتی ہے نہ اس سے پہلے عدم تھا اور نہ اسے عدم لاحق ہوگا (یعنی کوئی ایسی ساعت نہیں گزری جس میں اللہ تعالیٰ کی ذات موجود نہ ہو اور کوئی ایسی ساعت نہیں آئے گی جس میں وہ موجود نہ ہوگا وہ ہمیشہ سے ہے ہمیشہ تک رہے گا) اور اس کے سوا جس پر بھی یہ اسم بولا جائے گا اس سے پہلے عدم ہے اور اور اس پر عدم کا لاحق ہونا جائز ہے اور اس کا وجود اپنے موجد کی جانب سے ہے اپنی ذات کی طرف سے نہیں ہے۔ اور اس معنی کے اعتبار سے صحیح ترین کلام وہی ہے جو شاعر نے کہا ہے، لبید کا قول ہے:

أَلا کل شی ما خلا اللہ باطل

خبردار سنو! اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے باطل ہے۔

اور اسی کی طرف اشارہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٨﴾ (ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے اسی کی حکمرانی ہے اور اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا)

مسئلہ نمبر 4۔ حق کا مقابلہ ضلال کے ساتھ کرنا لغۃً اور شرعاً معروف ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے اور اسی طرح حق کا مقابلہ باطل کے ساتھ کرنا بھی لغۃً اور شرعاً معروف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ (الحج: 62) (نیز اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو خدائے برحق ہے اور جسے وہ پوجتے ہیں اس کے علاوہ وہ سراسر باطل ہے)

اور ضلال کا حقیقی معنی حق سے نکلنا ہے۔ یہ ضلال الطریق سے لیا گیا ہے اور یہ ہے راستے کی سمت سے پھر جانا۔ ابن عرفہ نے کہا ہے: عربوں کے نزدیک ضلالۃ سے مراد ایسے راستے پر چلنا ہے جو مقصود اور منزل کا نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: ضل عن الطریق (وہ راستے سے بھٹک گیا) اور أضل الشیٔ جب وہ کسی شے کو ضائع کردے۔ اور شرعاً یہ اس عبارت کے ساتھ خاص ہے۔ العدول عن السداد فی الأعتقاد دون الأعمال (اعتقاد میں صحیح (سمت) سے پھر جانا نہ کہ اعمال میں) اور اس کے بارے میں غریب قول یہ بھی ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے بارے معرفت نہ ہونے کو ضلال سے تعبیر کیا جاتا ہے جب اس کے مقابلے میں غفلت ہو اور اس کے عدم کے ساتھ جہالت یا شک مقترن نہ ہو۔ اور اسی پر علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو محمول کیا ہے: وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ﴿٧﴾ (الضحیٰ) ای غافلا یہ اس کی کئی تاویلات میں سے ایک ہے اور اس کی تصدیق اللہ تعالیٰ کا یہ قول کرتا ہے مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (الشوریٰ: 52) (نہ آپ یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے)۔

مسئلہ نمبر 5۔ عبداللہ بن عبدالحکم اور اشہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس قول باری تعالیٰ: فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا

1۔ صحیح بخاری، کتاب التہجد، جلد 1، صفحہ 151

الضَّلٰلُ میں روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: شطرنج اور چوسر (نرد) کھیلنا گمراہی میں سے ہے۔ اور یونس نے ابن وہب سے روایت کیا ہے کہ ان سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو اپنے گھر میں اپنی بیوی کے ساتھ چودہ گوٹیوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میرے لیے یہ کتنی تعجب کی بات ہے، حالانکہ یہ مومنین کی شان نہیں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ (پس حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے) اور یونس نے اشہب سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے شطرنج کھیلنے کے بارے پوچھا گیا، تو انہوں نے فرمایا: اس میں خیر اور بھلائی نہیں ہے اور یہ کوئی شے نہیں ہے اور یہ باطل ہے اور کھیل تمام کے تمام باطل میں سے ہیں۔ بلاشبہ صاحب عقل کو چاہیے کہ اس کی ریش اور بڑھاپا اسے باطل سے رد کے (1)۔ اور زہری رحمۃ اللہ علیہ سے جب شطرنج کے بارے پوچھا گیا، تو انہوں نے کہا: یہ باطل میں سے ہے اور میں اسے پسند نہیں کرتا۔

مسئلہ نمبر 6۔ علماء نے شطرنج وغیرہ کھیلنے کے جواز میں اختلاف کیا ہے جب یہ جوئے کی صورت پر نہ ہو۔ پس شطرنج کے بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور فقاء کے مذہب کا ماحصل یہ ہے کہ جو اس کے ساتھ جوا نہ کھیلے اور اپنی اہلیہ کے ساتھ گھر میں چھپ کر مہینے میں یا سال میں ایک بار کھیلے۔ اس پر نہ کوئی مطلع ہو اور نہ اس کے بارے کسی کو علم ہو تو وہ اس کے لیے معفو عنہ ہے، نہ اس پر حرام ہے اور نہ اس کے لیے مکروہ ہے۔ اور اگر وہ اس میں منہمک ہو گیا اور اس میں مشہور ہو گیا تو اس کی مروت اور عدالت ساقط ہو جائے گی اور اس کی شہادت رد کر دی جائے گی۔ اور رہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تو ان کے اصحاب کے مذہب میں نرد (چوسر) اور شطرنج کھیلنے والے کی شہادت ساقط نہیں ہوتی، جب کہ وہ اپنے جمیع ساتھیوں میں عادل ہو اور اس کی طرف سے سفاہت، شک اور گناہ کبیرہ ظاہر نہ ہو مگر یہ کہ وہ اس کے ساتھ جوا کھیلنے لگے، پس اگر اس کے ساتھ اس نے جوا کھیلا اور وہ اس کے ساتھ معروف ہو گیا تو اس کی عدالت ساقط ہو جائے گی اور باطل کے ذریعے مال کھانے کی وجہ سے اس نے اپنے آپ کو سفیہ (بے وقوف) بنا دیا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ شطرنج، نرد، اربعہ عشر کھیلنا اور ہر لہو مکروہ ہے۔ اور اگر ان کے ساتھ کھیلنے والے سے گناہ کبیرہ ظاہر نہ ہو اور اس کی خوبیاں اور نیکیاں اس کی برائیوں سے زیادہ ہوں تو ان کے نزدیک اس کی شہادت قبول کی جائے گی۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: شافعیہ نے کہا ہے بے شک شطرنج نرد کے مخالف ہے، کیونکہ اس میں فہم کو تیز کرنے اور طبیعت کو عمل کے قابل بنانے کی صلاحیت ہے اور نرد جوا ہے، دھوکا ہے وہ اسے نہیں جانتا جو اس میں اس کے لیے نکلے گا جیسا کہ فال کے تیروں کے ساتھ تقسیم کا مطالبہ کرنا۔

مسئلہ نمبر 7۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: نرد وہ کٹا ہوا ٹکڑا ہے جو بقس کی لکڑی سے اور ہاتھی کی ہڈی سے بھرا ہوا ہو اور اسی طرح شطرنج بھی ہے، کیونکہ یہ اس کا بھائی ہے اسی کے دودھ سے اسے غذا دی گئی ہے اور نرد وہ ہے جو باطل کے نام سے معروف ہے، اس کی پہچان کعاب کے نام سے بھی ہے اور اسے دور جاہلیت میں ارن کے نام سے پہچانا جاتا تھا اور یہ نردشیر

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 1052

کے نام سے بھی معروف ہے۔
اور صحیح مسلم میں سلیمان بن بریدہ سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت بیان کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی نردشیر کے ساتھ کھیلا تو گویا اس نے اپنا ہاتھ خنزیر کے گوشت اور اس کے خون میں ڈالا'' (1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس آدمی کی طرح ہے جس نے اپنا ہاتھ خنزیر کے گوشت میں ڈالا جو اس نے تیار کیا ہوا تھا تا کہ اسے کھائے اور خنزیر میں ایسا کرنا حرام ہے، جائز نہیں ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد اسے بیان کرتا ہے: ''جو نرد کے ساتھ کھیلا تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) کی نافرمانی کی'' (2)۔ اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔ اور آپ نرد کے ساتھ کھیلنا کلی طور پر حرام قرار دے رہے ہیں اور اسی طرح شطرنج بھی ہے، آپ نے کسی وقت کی استثنا نہیں کی ہے اور نہ ہی کسی حال کی استثنا کی ہے اور یہ خبر دی ہے کہ ایسا کرنے والا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرنے والا ہے، مگر اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ نرد جس کے ساتھ کھیلنے سے منع کیا گیا ہے اس سے مراد جوئے کی طرز پر کھیلنا ہو، کیونکہ بغیر جوئے کے شطرنج کھیلنے کی اجازت تابعین سے مروی ہے، (لیکن) اسے عموم پر محمول کرنا چاہیے اس میں جوا ہو یا نہ ہو زیادہ اولیٰ ہے اور اس میں احتیاط زیادہ ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابوعبداللہ حلیمی نے کتاب ''منہاج الدین'' میں کہا ہے: شطرنج کے بارے میں جو حدیث آئی ہے اس میں اسی طرح روایت کیا گیا ہے جیسے نرد کے بارے میں روایت کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی شطرنج کے ساتھ کھیلا تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی''۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ بنی تمیم کی مجالس میں سے ایک مجلس کے پاس سے گزرے اس حال میں کہ وہ شطرنج کھیل رہے تھے تو آپ اس کے پاس ٹھہر گئے اور فرمایا: ''خبردار سنو! قسم بخدا! تم اس کے سوا کے لیے پیدا کیے گئے ہو! خبردار سنو! قسم بخدا! اگر یہ سنت نہ ہوتی (۱) تو میں انہی کے ساتھ تمہارے چہروں پر مارتا''۔
اور آپ رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ آپ ایک قوم کے پاس سے گزرے وہ شطرنج کھیل رہے تھے تو آپ نے فرمایا: یہ کیسے بت ہیں جن کے ساتھ تم چمٹے پڑے ہو، کیونکہ تم میں سے کسی کا (آگ کا) انگارہ پکڑنا اسے پکڑنے سے بہتر ہیں، یہاں تک کہ وہ اسے بجھا دے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے شطرنج کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: یہ نرد سے زیادہ بری ہے۔ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: شطرنج کے ساتھ نہیں کھیلا مگر خطا اور گناہ کرنے والا۔ اور ابوجعفر سے شطرنج کے بارے سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا: ہم نے اس مجوسیت کو چھوڑ دیا ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ سے ایک طویل حدیث میں ہے: ''بے شک جو کوئی نرد، شطرنج، جوز (اخروٹ) اور کعاب کے ساتھ کھیلا اللہ تعالیٰ اس سے نفرت رکھتا ہے اور جو کوئی نرد اور شطرنج کھیلنے والوں کے پاس بیٹھا تا کہ ان کی طرف دیکھے تو اس سے اس کی ساری نیکیاں مٹا دی گئیں اور وہ ان میں سے ہو گیا

1۔ صحیح مسلم، کتاب تحریم اللعب، جلد 2، صفحہ 240 2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، صفحہ 275۔ موطا امام مالک، کتاب الجامع، صفحہ 724
ا۔ المنہاج میں یہاں لفظ سبقۃ ہے۔ مترجم

جنہیں اللہ تعالیٰ نے مبغوض بنا دیا"۔ یہ تمام آثار اس پر دلالت کرتے ہیں کہ بغیر جوئے کے بھی ان کے ساتھ کھیلنا حرام ہے، واللہ اعلم۔ اور ہم نے سورۃ المائدہ میں اس کی تحریم کا بیان ذکر کیا ہے اور یہ کہ یہ تحریم میں خمر (شراب) کی مثل ہے، کیونکہ یہ اسی کے ساتھ مقترن ہے، واللہ اعلم۔

ابن عربی نے قبس میں کہا ہے: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے جائز قرار دیا ہے اور ان میں سے بعض کی حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ وہ کہنے لگے: یہ مندوب (مستحب) ہے یہاں تک کہ انہوں نے اسے مدرسہ میں رکھ دیا اور جب طالب پڑھنے سے تھک جاتے تو وہ اس کے ساتھ مسجد میں کھیلتے۔ اور انہوں نے صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت کی طرف اس کی نسبت کی ہے کہ وہ اس کے ساتھ کھیلتے رہے ہیں اور یہ کبھی نہیں ہوا۔ قسم بخدا! کسی متقی کے ہاتھ نے اسے مس نہیں کیا۔ اور وہ کہتے ہیں: بے شک یہ ذہن کو تیز کرتی ہے اور ظاہر ان کی تکذیب کرتا ہے، کسی ذہین آدمی نے اس میں کبھی تجربہ حاصل نہیں کیا۔ میں نے امام ابوالفضل عطا مقدسی کو مسجد اقصیٰ میں مناظرہ کے دوران یہ کہتے ہوئے سنا ہے: بے شک یہ (فن) حرب سکھاتی ہے، تو انہیں طرطوشی نے کہا: بلکہ یہ تو جنگ کی تدبیر کو فاسد کرتی ہے، کیونکہ جنگ سے مقصود تو بادشاہ ہی اور اس کی مدہوشی ہوتا ہے۔ اور شطرنج میں تو کہتا ہے: شاہ تو بچ! بادشاہ کو میرے راستے سے دور کر دے، پس اس نے حاضرین کو ہنسا دیا۔

اور کبھی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں سختی کی ہے اور اسے حرام قرار دیا ہے اور اس بارے میں کہا ہے: فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ اور کبھی اس میں تھوڑی سہولت اور آسانی پیدا کی ہے۔ لیکن پہلا قول ہی اصح ہے۔ واللہ اعلم

اگر کوئی کہنے والا کہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان سے شطرنج کے بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے پوچھا: شطرنج کیا ہے؟ تو آپ کو بتایا گیا: بے شک ایک عورت کا ایک بیٹا تھا اور وہ بادشاہ تھا پس وہ جنگ میں اپنے ساتھیوں کے بغیر مارا گیا، تو اس نے کہا: یہ کیسے ہو سکتا ہے تم مجھے یہ واضح اور ظاہر کر کے دکھاؤ، تو اس کے لیے شطرنج کا عمل کیا گیا، پس جب اس نے اسے دیکھا تو اسے اس سے تسلی ہو گئی اور انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے شطرنج کا وصف بیان کیا تو آپ نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں جو آلہ حرب میں سے ہے۔ تو اسے جواباً یہ کہا جائے گا: اس میں کوئی حجت نہیں ہے، کیونکہ آپ نے شطرنج کے بارے لا باس (کوئی حرج نہیں) کے الفاظ نہیں کہے بلکہ آپ نے کہا: لا باس بما کان من آلة الحرب (اس میں کوئی حرج نہیں جو آلہ حرب میں سے ہے) بلاشبہ آپ نے یہ کہا: کیونکہ آپ پر یہ مشتبہ ہو گیا کہ شطرنج کے ساتھ کھیلنا ان میں سے ہے جن کے ساتھ اس جنگ کی پہچان میں مدد حاصل کی جاتی ہے۔ پس جب آپ کو یہ بتایا گیا اور آپ کا علم اسے محیط نہ ہوا تو آپ نے کہا: لا باس بما کان من آلة الحرب اگر اسی طرح ہے جیسے تم کہہ رہے ہو تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں اور اسی طرح صحابہ کرام میں سے وہ جس نے آپ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ آپ نے اس سے منع نہیں کیا، تو بے شک آپ سے اسے اس پر محمول کیا جائے گا کہ آپ کا گمان تھا کہ یہ وہ ہے جس کے ساتھ مشغولیت اور غفلت نہیں ہوتی، بلکہ اس سے جنگ اور اس کے دوران باہم ضرب لگانے کے علم کا سبب بننے کا ارادہ کیا جاتا ہے یا اس بنا پر کہہ دیا کہ خبر مندان تک پہنچی ہی نہیں۔ حلیمی نے کہا ہے: جب خبر صحیح ہے تو پھر اس کے ہوتے ہوئے کسی کے لیے کوئی حجت نہیں، بلاشبہ اس میں تمام کے

خلاف حجت ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ ابن وہب نے اپنی اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بچوں کے پاس سے گزرے وہ کجہ کے ساتھ کھیل رہے تھے اور یہ (چھوٹا سا) گڑھا کھود کر اس میں سنگریزوں کے ساتھ کھیلتے تھے، ابن وہب نے بیان کیا ہے: پس حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے بند کر دیا اور انہیں اس سے منع فرمایا۔ اور ہروی نے باب (الکاف مع الجیم) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ذکر کیا ہے: ہر شے میں جوا ہے حتی کہ کجہ کے ساتھ بچوں کے کھیل میں بھی ہے۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے: وہ یہ ہے کہ ایک بچہ کپڑے کا ٹکڑا لیتا ہے اور اسے گول بنا لیتا ہے گویا کہ وہ گیند ہے۔ پھر اس کے ساتھ جوا کھیلتے ہیں۔ اور وکج جب کوئی کجہ کے ساتھ کھیلے۔

قولہ تعالیٰ: فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ یعنی تمہاری عقلوں کو کیسے ان کی عبادت کی طرف پھیرا جا رہا ہے جو نہ رزق دے سکتے ہیں، نہ زندہ کر سکتے ہیں اور نہ موت دے سکتے ہیں۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْۤا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

"یونہی ثابت ہو چکی ہے آپ کے رب کی بات ان پر جو فسق و فجور کرتے ہیں کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے"۔

قولہ تعالیٰ: كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ یعنی یونہی آپ کے رب کا حکم، اس کا فیصلہ اور اس کا علم سابق ثابت ہو چکا ہے۔ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْۤا ان پر جو طاعت سے نکل گئے اور انہوں نے کفر کیا اور تکذیب کی۔ اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ کہ وہ تصدیق نہیں کریں گے۔ اور اس میں قدریہ کے خلاف مکمل دلیل موجود ہے۔ نافع اور ابن عامر نے یہاں اور اس کے آخر میں كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ اور سورۂ غافر میں تینوں مقامات پر اسے جمع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے صیغہ مفرد کے ساتھ۔ اور ان محل نصب میں ہے، یعنی بانھم یا لانھم۔ زجاج نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ کلمات سے بدل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہو۔ فراء نے کہا ہے: استیناف کی بنا پر کسرہ کے ساتھ انھم پڑھنا بھی جائز ہے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾

"(اے حبیب!) آپ پوچھیے کیا تمہارے معبودوں میں کوئی ہے جو آغاز آفرینش بھی کرے پھر (فنا کے بعد) اسے لوٹا بھی دے، آپ ہی فرمائیے: اللہ ہی آفرینش کی ابتدا بھی کرتا ہے اور (فنا کے بعد) اسے لوٹاتا بھی ہے پس (ہوش کرو) تم کدھر پھرے جاتے ہو"۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ یعنی کیا تمہارے الٰہوں اور تمہارے معبودوں میں کوئی ہے؟ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم زجر و توبیخ اور تقریر کی جہت پر آپ انہیں فرمائیے (جو آغاز آفرینش بھی کرے اور پھر (فنا کے بعد) اسے لوٹا بھی دے) پس اگر وہ آپ کو جواب دیں (تو بہتر) ورنہ آپ انہیں فرمائیں: قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (اللہ ہی آفرینش کی ابتدا بھی کرتا ہے اور (فنا کے بعد) اسے لوٹا بھی دیتا ہے) اور اس کے سوا کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔

فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ یعنی تم کیسے حق سے باطل کی طرف پلٹ رہے ہو اور پھر رہے ہو۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ مَّنْ یَّهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ یَهْدِیْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ یَّهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝

''آپ فرمائیے کیا تمہارے معبودوں میں سے کوئی حق کی طرف رہنمائی کرسکتا ہے (خود ہی جواباً) فرمائیے اللہ ہی حق کی طرف رہنمائی فرماتا ہے، تو کیا جو راہ دکھائے حق کی وہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود ہی راہ نہ پائے مگر یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے (اے مشرکین!) تمہیں کیا ہو گیا؟ تم کیسے غلط فیصلے کرتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ مَّنْ یَّهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ کہا جاتا ہے: هداه الطریق والی الطریق دونوں کا معنی ایک ہے (اس نے اسے راستے کی رہنمائی کی) اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی کیا تمہارے معبودوں میں سے کوئی ہے جو دین اسلام کی طرف رہنمائی کرسکتا ہو۔ پس جب وہ کہیں نہیں اور یہ ضروری ہے۔ قُلِ اللّٰهُ یَهْدِیْ لِلْحَقِّ تو پھر آپ انہیں فرمائیے: اللہ ہی حق کی طرف رہنمائی فرماتا ہے۔ پھر آپ انہیں زجر و توبیخ کرتے ہوئے اور بات کو پختہ کرتے ہوئے فرمائیے: اَفَمَنْ یَّهْدِیْۤ تو کیا وہ جو رہنمائی کرتا ہے۔ اِلَى الْحَقِّ (حق کی طرف) اور وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّهْدٰى مراد وہ بت ہیں جو کسی کی رہنمائی نہیں کرسکتے، نہ وہ چل سکتے ہیں مگر یہ کہ انہیں اٹھایا جائے اور نہ وہ اپنی جگہ سے منتقل ہو سکتے ہیں مگر یہ کہ انہیں منتقل کیا جائے، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

للفتى عقلٌ يعيش به حيث تَهْدِي ساقَه قدمُه

نوجوان کے لیے عقل ہے جس کے ساتھ وہ زندگی گزارتا ہے اس طرح کہ اس کے پاؤں اس کی پنڈلی کی رہنمائی کرتے ہیں۔

اور کہا گیا ہے: اس سے مراد وہ رؤسا اور گمراہ کرنے والے ہیں جو اپنی بھی ہدایت کی طرف رہنمائی نہیں کرسکتے مگر یہ کہ ان کی رہنمائی کی جائے اور یَهِدِّیْ میں چھ قراء تیں ہیں: (۱) سوائے ورش کے اہل مدینہ نے یَهْدِّیْ یا کے فتحہ، ہا کے سکون اور دال کی تشدید کے ساتھ قراءت کی ہے۔ پس انہوں نے اپنی قراءت میں دو ساکنوں کو جمع کیا ہے جیسا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قول: لَا تَعْدُوْا اور تَخِصِّمُوْنَ میں کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: دو ساکنوں کے جمع ہونے کی صورت میں کوئی بھی اسے بولنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ محمد بن یزید نے کہا ہے: جو بھی اس طرح کا قصد کرے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسرہ کی طرف مائل کرکے خفیف سی حرکت دے اور سیبویہ اسے اختلاس حرکت کا نام دیتے ہیں۔

(۲) ابو عمرو اور قالون نے ایک روایت میں اسے فتحہ اور اسکان کے درمیان پڑھا ہے، یہ اخفا اور اختلاس کے بارے میں ان کے مذہب کی بنا پر ہے۔

(۳) ابن عامر، ابن کثیر، ورش اور ابن محیصن نے یَهَدِّیْ یا اور ہا کے فتحہ اور دال کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے

کہا ہے: یہ قراءت عربی میں بین اور واضح ہے، یہ اصل میں یھتدی ہے تا کو دال میں ادغام کر دیا گیا ہے اور اس کی حرکت ہا کو دے دی گئی ہے۔

(۴) حفص، یعقوب اور اعمش نے ابوبکر سے ابن کثیر کی قراءت کی مثل قراءت کی ہے، مگر یہ کہ انہوں نے ہا کو کسرہ دیا ہے انہوں نے کہا ہے: کیونکہ جزم کو جب مجبوراً حرکت دی جائے تو اسے کسرہ کی حرکت دی جاتی ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: یہ سفلی مضر کی لغت ہے۔

(۵) ابوبکر نے عاصم سے یِہِدّی یا اور ہا کے کسرہ اور دال کی تشدید کے ساتھ قراءت کی ہے، یہ تمام کسرہ کی اتباع کی وجہ سے ہے جیسا کہ سورۃ البقرہ میں یَخْطَف کے تحت گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کی لغت ہے جنہوں نے نِسْتَعِین اور لن یِمَسَّنا النار وغیرہ پڑھا ہے۔ اور سیبویہ یِہِدّی کو جائز قرار نہیں دیتے البتہ تِہِدّی، نِہِدّی اور اِہِدّی میں جائز قرار دیتے ہیں انہوں نے فرمایا: کیونکہ یا میں کسرہ ثقیل ہوتا ہے۔

(۶) حمزہ، کسائی، خلف، یحیٰی بن وثاب اور اعمش نے یَہْدِی یا کے فتحہ، ہا کے سکون اور دال کی تخفیف کے ساتھ قراءت کی ہے۔ یہ ھَدٰی یَھْدِی سے ہے۔ نحاس نے کہا ہے: عربی میں اس قراءت کی دو وجہیں ہیں اگرچہ وہ بعید ہیں، دو وجہوں میں سے ایک یہ ہے کہ کسائی اور فراء دونوں نے کہا ہے: یھدی بمعنی یھتدی ہے۔ ابو العباس نے کہا ہے: یہ معروف نہیں ہے، لیکن تقدیر عبارت ہے أمن لا یھدی غیرہ (کیا وہ جو غیر کی رہنمائی نہیں کر سکتا) کلام مکمل ہو گئی۔ پھر کہا: اِلَّاۤ اَنْ یُّهْدٰی یہ اول سے نیا کلام ہے، یعنی لیکن وہ محتاج ہے کہ اس کی رہنمائی کی جائے۔ پس یہ استثنا منقطع ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: فلان لا یُسمِع غیرہ اِلَّا أنْ یسمع ای لکنہ یحتاج أنْ یُسْمَعَ (فلاں غیر کو سنا نہیں سکتا لیکن وہ محتاج ہے کہ اسے سنایا جائے)

ابو اسحاق نے کہا ہے: فَمَا لَكُمْ یہ کلام تام ہے اور اس کا معنی ہے: پس بتوں کی عبادت میں تمہارے لیے کون سی شے ہے۔ پھر انہیں کہا گیا: كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ تم اپنے لیے کیسے فیصلے کرتے ہو اور تم یہ صریح باطل فیصلے کر رہے ہو، تم ایسے معبودوں کی عبادت کرتے ہو جو اپنے آپ کو بھی کسی چیز کا نفع نہیں دے سکتے مگر یہ کہ ان کے ساتھ کوئی عمل کیا جائے۔ اور اللہ تعالیٰ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے اور تم اس کی عبادت چھوڑ رہے ہو۔ پس كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ کے سبب محل نصب میں ہے۔

وَ مَا یَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَفْعَلُوْنَ ۝۳۶

"اور نہیں پیروی کرتے ان میں سے اکثر مگر محض وہم و گمان کی، بلاشبہ وہم و گمان بے نیاز نہیں کر سکتا حق سے ذرہ بھر، بے شک اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا یَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا مراد ان کے رؤسا (سردار) ہیں، یعنی وہ اس بارے میں محض تیز فہمی اور ظن و تخمین کی پیروی کرتے ہیں کہ وہ معبود ہیں اور وہ شفاعت کریں گے اور ان کے پاس اس پر کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے۔ اور رہے ان کی اتباع کرنے والے تو وہ صرف تقلید کے طور پر ان کی پیروی کرتے ہیں۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْـًٔا یعنی اللہ

تعالیٰ کے عذاب سے (وہم وگمان انہیں بے نیاز نہیں کرسکتا) اور حق تو خود اللہ تعالیٰ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الحق سے مراد یقین ہے، یعنی ظن یقین کی مثل نہیں ہے۔ اور اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ عقائد میں صرف ظن پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ بے شک اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ کفر اور تکذیب کا عمل کرتے ہیں، یہ آیت تہدید (جھڑک) کے محل میں واقع ہے۔

وَ مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾

''اور نہیں ہے یہ قرآن کہ گھڑ لیا گیا ہو اللہ تعالیٰ (کی وحی آئے بغیر) بلکہ یہ تو تصدیق کرنے والا ہے اس وحی کی جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہے اور الکتاب کی تفصیل ہے ذرہ شک نہیں اس میں کہ رب العالمین کی طرف سے (اتری) ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اس میں أن، یفتری کے ساتھ مل کر مصدر ہے اور اس کا معنی ہے: وما کان هذا القرآن إفتراء (یہ قرآن گھڑا ہوا نہیں ہے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: فلان یحب أن یرکب، ای یحب الرکوب (فلاں سوار ہونے کو پسند کرتا ہے) یہ کسائی نے کہا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اس قرآن کے لیے مناسب نہیں کہ اسے گھڑ لیا گیا ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ (آل عمران: 161) (اور نہیں ہے کسی نبی کی یہ شان کہ خیانت کرے) وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً (التوبہ: 122) (اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن نکل کھڑے ہوں سارے کے سارے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ أن بمعنی لام اور تقدیر کلام یہ ہو: وما کان هذا القرآن لیفتری(1) (اور نہیں ہے یہ قرآن کہ اسے گھڑ لیا گیا ہو)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بمعنی لا ہے، ای لا یفتری (اسے گھڑا نہیں گیا ہے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کسی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ غیر اللہ کی جانب سے اس قرآن کی مثل لائے پھر اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دے اس قرآن کے اعجاز، اس کے وصف، اس کے معانی اور اس کی تالیف وترکیب کی وجہ سے۔ وَ لٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ کسائی، فراء اور محمد بن سعدان نے کہا ہے: تقدیر عبارت ہے ولکن کان تصدیق (بلکہ یہ تصدیق کرنے والا ہے) الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (اس وحی کی جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہے) یعنی تورات، انجیل اور دیگر کتب، کیونکہ انہوں نے اس کی بشارت دی اور یہ اس بشارت میں اور توحید اور قیامت کے ساتھ ایمان لانے کی دعوت میں ان کی تصدیق کرنے والا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے بلکہ یہ تو اس نبی کی تصدیق کرنے والا ہے جو قرآن سے پہلے آیا ہے اور وہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ انہوں نے آپ کا مشاہدہ کیا ہوا تھا اس سے پہلے کہ وہ آپ سے قرآن سنتے۔ وَ تَفْصِيْلَ میں نصب اور رفع دونوں جائز ہیں انہی دو وجہوں کی بنا پر جو تصدیق میں مذکور ہیں۔ اور التفصیل کا معنی تبیین (وضاحت کرنا) ہے، یعنی قرآن کریم اس کی

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 157

وضاحت کرتا ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے سابقہ کتابوں میں لکھا۔ اور الکتاب اسم جنس ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ تفصیل الکتاب سے مراد وہ ہے جو قرآن کریم میں احکام کی وضاحت کی گئی ہے۔ لَا رَیْبَ فِیْهِ اس میں ہا ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی قرآن کریم میں کوئی شک نہیں یعنی اس کے اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہونے میں کوئی شک نہیں۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۳۸

"کیا یہ (کافر) کہتے ہیں کہ اس نے خود گھڑ لیا ہے اسے، آپ فرمائیے پھر تم بھی لے آؤ ایک سورت اس جیسی اور (امداد کے لیے) بلا لو جن کو تم بلا سکتے ہو اللہ تعالیٰ کے علاوہ اگر تم (اپنے الزام میں) سچے ہو"۔

قولہ تعالیٰ: اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ یہاں اَم ہمزہ استفہام کے محل میں ہے، کیونکہ یہ اپنے ماقبل کے ساتھ متصل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ اَم منقطعہ ہے جو بل اور ہمزہ کے معنی کے ساتھ مقدر ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: الٓمّٓ ۝ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ (السجدہ) ای بل أیقولون افتراہ (بلکہ کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے خود اسے گھڑ لیا ہے) اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: اَم بمعنی واؤ ہے، اور یہ جائز ہے: ویقولون افتراہ (اور وہ کہتے ہیں کہ اس نے خود اسے گھڑ لیا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ میم صلہ ہے اور تقدیر کلام ہے: أیقولون افتراہ، ای إختلق محمد القرآن من قبل نفسہ (کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے) پس یہ استفہام تقریع اور ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے معنی میں ہے۔

قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ کلام کا معنی حجت بیان کرنا ہے، کیونکہ پہلی آیت اس پر دلیل ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، کیونکہ یہ اپنے سے پہلے ہونے والی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے ساتھ موافقت کرتا ہے بغیر اس کے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے تعلیم حاصل کی ہو۔ اور یہ آیت ان پر یہ لازم کر رہی ہے کہ وہ اس کی مثل ایک سورت لے آئیں اگر یہ گھڑا ہوا ہے۔ اور قرآن کریم کے اعجاز کے بارے میں کلام پہلے مقدمۃ الکتاب میں گزر چکی ہے کہ یہ معجزہ ہے۔ والحمدللہ۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیْنَ ۝۳۹

"بلکہ انہوں نے جھٹلایا اس چیز کو جسے وہ پوری طرح نہ جان سکے اور نہیں آیا ان کے پاس اس کا انجام، اسی طرح (بے علمی سے) جھٹلایا انہوں نے جو ان سے پہلے تھے پھر دیکھ لو کیسا انجام ہوا ظالموں کا"۔

قولہ تعالیٰ: بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ یعنی انہوں نے قرآن کو جھٹلایا اور وہ اس کے معانی اور اس کی تفسیر سے جاہل اور ناواقف تھے اور ان پر لازم ہے کہ وہ اسے سوال کے ذریعے جانیں۔ پس یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ واجب ہے کہ تاویل میں غور و فکر کی جائے۔ اور قولہ تعالیٰ: وَلَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ یعنی ان پر عذاب نازل ہو کر جھٹلانے کے انجام کی حقیقت ظاہر نہیں

ہوئی یا انہوں نے اسے جھٹلایا جو موت کے بعد اٹھائے جانے، جنت اور دوزخ کے ذکر میں سے قرآن کریم میں موجود ہے اور جو ان کے لیے کتاب میں وعید کی گئی اس کی حقیقت ان کے پاس نہیں آئی، یہ حضرت ضحاک نے کہا ہے۔ اور حسین بن فضل سے پوچھا گیا: کیا تم قرآن کریم میں یہ پاتے ہو (جو کسی شی سے جاہل ہو وہ اس کا دشمن ہوتا ہے)؟ آپ نے فرمایا: ہاں، یہ دو مقام پر ہے: بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ۔ اور ایک قول باری تعالیٰ ہے: وَ اِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَاۤ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ۝ (الاحقاف) (اور کیونکر انہیں ہدایت نصیب نہیں ہوئی قرآن سے تو اب ضرور کہیں گے کہ (اجی) یہ تو وہی پرانا جھوٹ ہے) كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اس میں مراد گزشتہ امتیں ہیں (1)، یعنی جیسے ان کا طریقہ تھا۔ اور کاف محل نصب میں ہے۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ یعنی کیسے انہیں ہلاکت اور عذاب نے پکڑ لیا (اس میں دیکھ لو)

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝

''ان میں سے کچھ ایمان لائیں گے اس پر اور ان میں سے کچھ ایمان نہیں لائیں گے اس پر اور آپ کا رب خوب جانتا ہے مفسدوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ کہا گیا ہے: اس سے مراد اہل مکہ ہیں، یعنی ان میں سے کچھ مستقبل میں آپ کے ساتھ ایمان لائیں گے اگرچہ ان کی تکذیب طویل ہو جائے، کیونکہ ان کے بارے میں پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ انہیں یہ سعادت حاصل ہوگی۔ اور مَنْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور خبر جار و مجرور ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی ہے وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ اور اس کا معنی ہے اور ان میں سے کچھ اپنے کفر پر مصر رہیں گے یہاں تک کہ مر جائیں گے، جیسا کہ ابو طالب، ابولہب وغیرہما۔ اور بعض نے کہا ہے: مراد اہل کتاب ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تمام کفار کے لیے عام ہے۔ اور یہی صحیح ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک بہ میں ضمیر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ اس نے سزا اور عذاب کو مؤخر اس لیے کیا ہے کیونکہ ان میں سے کچھ عنقریب ایمان لے آئیں گے۔ وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ یعنی آپ کا رب انہیں خوب جانتا ہے جو اپنے کفر پر اصرار کر رہے ہیں۔ اور یہ ان کے لیے تہدید اور جھڑک ہے۔

وَ اِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَ لَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّاۤ اَعْمَلُ وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

''اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو فرما دیجئے میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل، تم بری الذمہ ہو اس سے جو میں کرتا ہوں اور میں بری الذمہ ہوں اس سے جو تم کرتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ، عَمَلِيْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور اس کا معنی ہے: تبلیغ کرنے، ڈرانے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے بارے میں میرے عمل کا ثواب میرے لیے ہے۔ وَ لَكُمْ عَمَلُكُمْ اور تمہارے عمل شرک وغیرہ کی جزا تمہارے لیے ہے۔ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّاۤ اَعْمَلُ وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ اس کی مثال یہ ہے، یعنی کسی ایک سے

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 158

دوسرے کے گناہ کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ اور یہ آیت آیت السیف سے منسوخ ہے۔ یہ حضرت مجاہد، کلبی، مقاتل اور ابن زید کے قول میں ہے۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُوْنَ اِلَیْكَ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَ لَوْ كَانُوْا لَا یَعْقِلُوْنَ ۝ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّنْظُرُ اِلَیْكَ اَفَاَنْتَ تَهْدِی الْعُمْیَ وَ لَوْ كَانُوْا لَا یُبْصِرُوْنَ ۝

''اور ان میں سے کچھ (بظاہر) کان لگاتے ہیں آپ کی طرف، تو کیا آپ سناتے ہیں بہروں کو خواہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں۔ اور ان میں سے کچھ (بظاہر) دیکھتے ہیں آپ کی طرف، تو کیا آپ راہ دکھاتے ہیں اندھوں کو خواہ وہ کچھ نہ دیکھتے ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُوْنَ اِلَیْكَ مراد ان کے ظواہر ہیں۔ اور ان کے دل تو اس میں سے کسی چیز کو محفوظ نہیں کرتے جو آپ انہیں حق میں سے کہتے ہیں اور جو قرآن کریم میں سے ان پر تلاوت کرتے ہیں، اسی لیے فرمایا ہے: اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَ لَوْ كَانُوْا لَا یَعْقِلُوْنَ، ای لا تُسْمِعُ (یعنی آپ نہیں سناتے) کلام میں بظاہر استفہام ہے لیکن اس کا معنی نفی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے دلوں پر مہر لگ جانے کی وجہ سے بہروں کی مانند بنا دیا، یعنی آپ اسے ہدایت دینے پر قدرت نہیں رکھتے جسے ہدایت کی بات سننے سے اللہ تعالیٰ نے بہرہ کر دیا ہو۔ اور اسی طرح معنی اس میں بھی ہے: وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّنْظُرُ اِلَیْكَ اَفَاَنْتَ تَهْدِی الْعُمْیَ وَ لَوْ كَانُوْا لَا یُبْصِرُوْنَ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ کوئی بھی اس کی توفیق اور اس کی ہدایت کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا (1)۔ یہ اور جو کلام اس کی مثل ہو وہ قدریہ کے اقوال کا رد کرتا ہے۔ جب کہ کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔ اور فرمایا ہے: یستمعون تو یہ من کے معنی کے اعتبار سے ہے اور ینظر، من کے لفظ کے اعتبار سے ہے اور مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دینا ہے، یعنی جس طرح آپ اسے سنانے   ت نہیں رکھتے جس کی قوت سماعت سلب کر لی گئی ہو اور آپ یہ قدرت نہیں رکھتے کہ اندھے کے لیے بصارت کو پیدا کر دیں کہ وہ اس کے ساتھ رہنمائی حاصل کر سکے، پس اسی طرح آپ ان کو ایمان کی توفیق دینے کی قدرت نہیں رکھتے اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے فیصلہ کر دیا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور یَّنْظُرُ اِلَیْكَ کا معنی ہے یعنی وہ مسلسل آپ کی طرف دیکھتا ہے، جیسا کہ فرمایا: یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ تَدُوْرُ اَعْیُنُهُمْ كَالَّذِیْ یُغْشٰی عَلَیْهِ مِنَ الْمَوْتِ (الاحزاب: 19) (کہ وہ آپ کی طرف یوں دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں چکرا رہی ہوتی ہیں اس شخص کی مانند جس پر موت کی غشی طاری ہو) کہا گیا ہے: بے شک یہ آیت استہزا کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْـًٔا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝

''یقیناً اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا لوگوں پر ذرہ برابر لیکن لوگ ہی اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں''۔

جب شقی (اور بدبخت) لوگوں کا ذکر کیا تو ساتھ ہی یہ ذکر بھی کیا کہ اس نے ان کے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا اور یہ کہ ان پر شقاوت کا چھا جانا اور دل کی سماعت اور بصارت کا سلب ہو جانا اس کی طرف سے ظلم اور زیادتی نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنی ملکیت

1۔ تفسیر الطبری، زیر آیت ہذہ

میں جیسے چاہے تصرف کر سکتا ہے اور وہ اپنے جمیع افعال میں عادل ہے۔ وَلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ لیکن لوگ اپنے نفسوں پر کفر، معصیت اور اپنے خالق کے حکم کی مخالفت کر کے ظلم کرتے ہیں (1)۔

حمزہ اور کسائی نے وَلٰكِنَّ مخفف اور النَّاسَ کو مرفوع پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: نحویوں کی جماعت جس میں فراء بھی ہیں ان کا خیال ہے کہ عرب جب کہیں ولکن واؤ کے ساتھ تو تشدید کو ترجیح دیتے ہیں (یعنی ولکن پڑھتے ہیں) اور جب واؤ کو حذف کر دیں تو تخفیف کو ترجیح دیتے ہیں (یعنی لکنّ پڑھتے ہیں) اور اس میں علت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ جب بغیر واؤ کے ہو تو یہ بل کے مشابہ ہوتا ہے پس انہوں نے اسے مخفف کر دیا تا کہ اس کا مابعد بل کے مابعد کی طرح ہو جائے اور جب یہ واؤ کے ساتھ آئے تو بل کے مخالف ہوتا ہے پس انہوں نے اسے مشدد کر دیا اور اس کے ساتھ (مابعد کو) نصب دی، کیونکہ یہ ان ہے جس پر لام اور کاف کا اضافہ کیا گیا ہے اور اسے ایک حرف بنا دیا گیا ہے اور شاعر کا قول ہے:

ولکنني من حبها لعميد

پس لعمید لام کے ساتھ ہے، کیونکہ (لکن) اصل میں اَن ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ؕ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝

"اور جس روز اللہ تعالیٰ جمع کرے گا انہیں (وہ خیال کریں گے) گویا وہ (دنیا میں) نہیں ٹھہرے مگر ایک گھڑی دن کی پہچانیں گے ایک دوسرے کو (تب حقیقت کھلے گی کہ) گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے جھٹلایا اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو اور وہ ہدایت یافتہ نہیں تھے"۔

قولہ تعالیٰ: وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْۤا یہ بمعنی کانہم ہے پھر اسے مخفف کر دیا گیا، یعنی گویا کہ وہ اپنی قبروں میں نہیں ٹھہرے۔ اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ یعنی دن کی ایک گھڑی کی مقدار، مراد یہ ہے کہ وہ قبروں میں اپنے طویل قیام کو اس خوف اور ڈر کی وجہ سے کم اور قلیل سمجھیں گے جو خوف دوبارہ اٹھائے جانے کے سبب وہ دیکھ رہے ہوں گے، اس کی دلیل ان کا یہ قول ہے: لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (الکہف: 19) (ہم ٹھہرے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ) اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک دنیا میں ان کے ٹھہرنے کی مدت اس ہول اور خوف سے کم ہے جو انہیں مستقبل میں ہوگا نہ کہ ان کے قبروں میں ٹھہرنے کی مدت۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ اپنی عمروں کی طوالت کو خلود (اور دوام) کے مقابلہ میں ایک گھڑی کی مثل دیکھیں گے۔ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ یہ یحشرھم میں ہا اور میم (ہم) سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ (اس سے) منقطع ہو اور گویا یہ فرمایا: فہم یتعارفون (پس وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے)۔ کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: ان میں سے بعض بعض کو پہچان لیں گے جیسا کہ وہ دنیا میں پہچانتے تھے جب وہ اپنی قبور سے نکلیں گے اور یہ تعارف زجر و توبیخ اور ذلت و رسوائی کا تعارف ہوگا۔ ان میں سے بعض بعض کو کہیں گے: تو نے مجھے گمراہ کیا تھا اور تو نے مجھے بھٹکایا تھا اور تو نے مجھے

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 159

کفر پر ابھارا تھا۔ یہ شفقت، نرمی اور مہربانی ورحم کا تعارف نہیں ہوگا۔ پھر معرفت اور پہچان ختم ہو جائے گی جب قیامت کے دن کی ہولناکیوں کو دیکھیں گے جیسا کہ فرمایا: وَلَا یَسْئَلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا ۝ (المعارج) (اور کوئی جگری دوست کسی جگری دوست کا حال نہ پوچھے گا) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زجر وتوبیخ کا تعارف باقی رہے گا اور یہی صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ...... تا قولہ...... وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْۤ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (سبا) (کاش! تم (وہ منظر) دیکھو جب یہ ظالم کھڑے ہو جائیں گے اپنے رب کے روبرو...... اور ہم ڈال دیں گے طوق ان لوگوں کی گردنوں میں جنہوں نے کفر کیا (خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے)

اور قولہ تعالیٰ: كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا، الآیہ (الاعراف: 38) (جب بھی داخل ہوگی کوئی امت وہ لعنت بھیجے گی دوسری امت پر)

اور قولہ تعالیٰ: رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا، الآیہ (الاحزاب: 67) (اے ہمارے رب! ہم نے پیروی کی اپنے سرداروں کی اور اپنے بڑے لوگوں کی)

اور رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَلَا یَسْئَلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا ۝ (المعارج) اور قولہ تعالیٰ: فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَاۤ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ (المومنون: 101) (تو جب صور پھونکا جائے گا تو کوئی رشتہ داریاں نہ رہیں گی ان کے درمیان) تو اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی رحمت وشفقت کا سوال اس سے نہیں پوچھے گا، واللہ اعلم۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قیامت کے کئی مقامات اور جگہیں ہیں (ان کے احکام مختلف ہوں گے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یَتَعَارَفُوْنَ کا معنی یتسألون ہے، یعنی وہ ایک دوسرے سے پوچھیں گے تم کتنی مدت ٹھہرے ہو، جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ (الصافات) (اور متوجہ ہوں گے ایک دوسرے کی طرف (اور) سوال جواب کریں گے) اور یہ اچھا ہے۔ اور حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ مومنین کے ایک دوسرے پر مہربان ہونے اور رحم کرنے کا تعارف ہے۔ اور کافروں پر کوئی مہربانی اور رحم نہیں ہے، جیسا کہ فرمایا: فَلَاۤ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ (المومنون: 101) اور پہلا قول زیادہ واضح اور ظاہر ہے۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وہ لوگ گھاٹے میں رہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہونے کو جھٹلایا۔ پھر کہا گیا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر ہو بعث ونشور پر دلالت کرنے کے بعد، یعنی وہ جنت کے ثواب سے محروم ہو گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہونے کی حالت میں خسارے میں رہے، کیونکہ خسارہ اس حالت میں ہوتا ہے جس میں اقالہ کی امید نہ ہو اور نہ ہی توبہ فائدہ اور نفع دے۔ نحاس نے کہا ہے: اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی یَتَعَارَفُوْنَ بَیْنَهُمْ ہو، وہ یہ کہتے ہیں۔ مَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہدایت یافتہ نہ تھے۔

وَاِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰی مَا یَفْعَلُوْنَ ۝۴۶

”اور خواہ ہم دکھا دیں آپ کو کچھ (عذاب) جس کا ہم نے وعدہ کیا ہے ان سے یا (پہلے ہی) ہم اٹھالیں

آپ کو (ہر حالت میں) ہماری طرف ہی انہیں لوٹنا ہے پھر اللہ تعالیٰ گواہ ہے اس پر جو وہ کرتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ یہ شرط ہے۔ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ یعنی آپ کی حیات میں آپ کے دین کو غالب کرنے کا (جو وعدہ ہم نے کیا ہے) اور مفسرین نے کہا ہے: وہ بعض جس کا ان کے ساتھ وعدہ تھا وہ ان کے قتل اور قید کا تھا جو بدر میں قتل کر دیے گئے اور قیدی بنا لیے گئے۔

اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ اس کا عطف نُرِيَنَّكَ پر ہے یعنی یا ہم آپ کو اس سے پہلے اٹھا لیں۔ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ یہ اِمّا کا جواب ہے۔ اور مقصود یہ ہے اگر آپ نے ان سے جلدی انتقام نہیں لیا تو ہم نے ان سے تاخیر کے ساتھ انتقام لے لیا۔ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ یعنی اللہ تعالیٰ شاہد (گواہ) ہے جو کسی شاہد کا محتاج نہیں۔ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ اس پر جو وہ آپ کے ساتھ جنگ اور آپ کی تکذیب کرتے ہیں۔ اور اگر کہا جائے: ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ بمعنی ھناك (پھر اللہ تعالیٰ وہاں گواہ ہوگا) یہ بھی جائز ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

"اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے پس جب آیا ان کا رسول (اور انہوں نے اس کو جھٹلایا) تو فیصلہ کر دیا گیا ان کے درمیان انصاف کے ساتھ اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا"۔

قولہ تعالیٰ: وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ معنی یہ ہوگا: ہر امت کے لیے ایک رسول ہے وہ ان پر شاہد ہوگا، جب ان کا رسول قیامت کے دن آئے گا تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اس کی مثل یہ ہے فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ (النسا: 41) (تو کیا حال ہوگا (ان نافرمانوں کا) جب ہم لے آئیں گے ہر امت سے ایک گواہ) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کل (قیامت کے دن) کفار اپنے پاس رسولوں کے آنے کا انکار کر دیں گے، تو ایک رسول لایا جائے گا اور وہ کہے گا: تحقیق میں نے تم تک پیغام پہنچایا، تو اس وقت ان کے خلاف عذاب کا فیصلہ کر دیا جائے گا، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ: 43) (اور (ہمارا) رسول تم پر گواہ ہوگا)

اور یہ بھی جائز ہے کہ معنی یہ ہو بے شک وہ دنیا میں عذاب نہیں دیے جائیں گے یہاں تک کہ وہ ان کی طرف رسول بھیجے پس جو ایمان لایا وہ کامیاب ہوا اور نجات پا گیا اور جو ایمان نہ لایا وہ ہلاک ہو گیا اور اسے عذاب دیا گیا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ (الاسراء) (اور ہم عذاب نازل نہیں کرتے جب تک ہم نہ بھیجیں کسی رسول کو) اور القسط کا معنی عدل ہے۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ یعنی بغیر گناہ کے نہ انہیں عذاب دیا جائے گا اور نہ بغیر حجت کے ان کا مواخذہ کیا جائے گا۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

"اور وہ کہتے ہیں کب پورا ہوگا یہ (عذاب کا) وعدہ اگر تم سچے ہو"۔

مراد کفار مکہ ہیں کیونکہ وہ اپنے انکار کی زیادتی اور اپنے لیے عذاب کے جلدی آنے کی طلب میں یہ کہتے تھے: عذاب کب آئے گا یا وہ قیامت کب آئے گی جس کے بارے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے وعدہ کرتے ہیں؟ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ عام

ہے ہر اس امت کو جس نے اپنے رسول کو جھٹلایا۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ۝۴۹

”آپ کہیے: نہیں مالک ہوں میں اپنے آپ کے لیے ضرر کا اور نہ نفع کا مگر جتنا چاہے اللہ تعالیٰ، ہر قوم کے لیے میعاد مقرر ہے، جب آئے گی ان کی مقرر میعاد تو نہ وہ پیچھے رہ سکیں گے ایک لمحہ اور نہ آگے بڑھ سکیں گے“۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا جب انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے عذاب کے جلدی آنے کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا: اے محمد! ﷺ آپ انہیں فرما دیجئے میں اپنے آپ کے لیے ضرر کا اور نہ نفع کا مالک نہیں ہوں، یعنی اس کی ملکیت نہ اپنے لیے ہے اور نہ اپنے سوا کسی اور کے لیے۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ مگر جتنا اللہ تعالیٰ چاہے کہ میں اس کا مالک ہوں اور اس پر قادر ہوں۔ تو میں کیسے قادر ہو سکتا ہوں کہ میں اس کا مالک بنوں جس کے جلدی آنے کا تم نے مطالبہ کیا پس تم جلدی کا مطالبہ نہ کرو۔ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ یعنی ہر قوم کی ہلاکت اور اس پر عذاب آنے کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم میں ایک معین وقت ہے۔ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ جب ان کی میعاد گزرنے کے ساتھ وہ معین وقت آئے گا۔ فَلَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ تو پھر ان کے لیے ممکن نہیں ہوگا کہ وہ دنیا میں باقی رہتے ہوئے ایک لمحہ بھی پیچھے رہ سکیں اور نہ وہ آگے بڑھ سکیں گے پس انہیں مہلت دی جا رہی ہے۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَیَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا یَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۵۰

”آپ فرمائیے (اے منکرو!) ذرا غور کرو اگر آ جائے تم پر اس کا عذاب راتوں رات یا دن دہاڑے (تو تم کیا کر لو گے) کس چیز کا جلدی مطالبہ کر رہے ہیں اس سے مجرم“۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَیَاتًا اَوْ نَهَارًا یہ دو ظرفیں ہیں۔ اور یہ ان کے اس قول کا جواب ہے: مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ (یونس: 48) اور یہ ان کے عذاب کے جلدی آنے کے مطالبہ میں ان کی آراء کی بے وقوفی اور احمقانہ پن ہے، یعنی اگر تم پر عذاب آ جائے تو اس میں تمہارا نفع کیا ہے اور اس وقت ایمان تمہیں کوئی نفع نہیں دے سکے گا۔ مَّاذَا یَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ یہ استفہام بمعنی تہویل و تعظیم ہے، یعنی کتنی بڑی اور عظیم ہے وہ شے جس کے جلدی آنے کا وہ مطالبہ کر رہے ہیں، جیسے اس کے لیے کہا جاتا ہے جو ایسے امر کا مطالبہ کرتا ہو جس کا انجام مضر ہو: تو اپنے خلاف کون سی چیز چن رہا ہے؟ منہ میں ضمیر کے بارے بعض نے کہا ہے: وہ عذاب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اگر تو منہ میں ھاء ضمیر کو بنائے کہ وہ عذاب کی طرف لوٹ رہی ہے تو پھر تیرے لیے ماذا میں دو تقدیریں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ما مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہو اور ذا بمعنی الذی ہو اور وہ ما کی خبر ہو اور ضمیر عائد محذوف ہو۔ اور دوسری تقدیر یہ ہے کہ ماذا ایک اسم مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہو اور مابعد جملہ اس کی خبر ہو۔ یہ زجاج نے کہا ہے۔ اور اگر منہ کی ہاء ضمیر کو بنائیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسم کی طرف لوٹ رہی ہے تو پھر تو ما اور ذا کو ایک

شے بنائے گا اور یہ یستعجل کے سبب محل نصب میں ہوگا۔ اور اس کا معنی ہوگا: أیّ شیٔ یستعجل منہ المجرمون من اللہ عزوجل (کون سی شے کو مجرم اللہ تعالیٰ سے جلدی طلب کر رہے ہیں)

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝۵۱

''کیا جب عذاب نازل ہو جائے گا تب ایمان لاؤ گے اس پر (فرشتے انہیں کہیں گے) اب (آنکھیں کھلیں) تم تو اس عذاب کے لیے بڑی جلدی مچا رہے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ اس کلام میں حذف ہے، تقدیر کلام ہے: أتأمنون أن ینزل بکم العذاب ثم یقال لکم إذا حل: آلان آمنتم بہ؟ (کیا تم ایمان لاؤ گے کہ تم پر عذاب نازل کیا جائے پھر تم کو کہا جائے گا جب وہ آ جائے: اب تم اس کے ساتھ ایمان لاؤ گے؟ کہا گیا ہے: یہ ان کے ساتھ بطور استہزا ملائکہ کا قول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کے قول میں سے ہے اور ہمزہ استفہام ثُمَّ پر داخل ہوا ہے یہ تقریر و توبیخ کے لیے ہے اور تاکہ یہ اس پر دلالت کرے کہ دوسرے جملے کا معنی پہلے کے بعد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہاں ثم بمعنی ثَم (ثا کے فتحہ کے ساتھ) ہے پس یہ ظرف ہوگی اور اس کا معنی ہوگا: أھنالک یہ علامہ طبری کا مذہب ہے (1)، اور اس وقت اس میں استفہام کا معنی نہ ہوگا۔ اور الآن کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ اصل میں حان کی مثل فعل مبنی ہے اور پھر اسے اسم کی طرف پھیرنے کے لیے اس پر لام لگا یا گیا ہے۔ اور خلیل نے کہا ہے: اسے التقاء ساکنین کی وجہ سے بنایا گیا ہے اور الف لام عہدی ہے اور اشارہ وقت کی طرف ہے، اور یہ دو زمانوں کی حد ہے۔ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تم تو اس عذاب کے لیے تَسْتَعْجِلُوْنَ جلدی مچا رہے تھے۔

ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝۵۲

''پھر کہا جائے گا ظالموں سے کہ چکھو (اب) دائمی عذاب (کا مزہ) کیا تمہیں بدلہ دیا جائے گا بجز اس کے جو تم کمایا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا یعنی ان کو جہنم کے داروغے کہیں گے۔ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ یعنی چکھو وہ عذاب جو ختم نہیں ہوگا۔ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ یعنی تمہارے کفر کا بدلہ تمہیں دیا جائے گا۔

وَيَسْتَنْۢبِئُوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؔۚ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝۵۳

''اور وہ دریافت کرتے ہیں آپ سے کیا یہ واقعی سچ ہے؟ آپ فرمائیے: ہاں! بخدا یہ سچ ہے اور تم (اللہ تعالیٰ کو) عاجز کرنے والے نہیں ہو''۔

قولہ تعالیٰ: وَيَسْتَنْۢبِئُوْنَكَ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم وہ آپ سے عذاب آنے اور قیامت قائم ہونے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ اَحَقٌّ یہ مبتدا ہے۔ هُوَ یہ سد مسد الخبر ہے۔ اور سیبویہ کا قول ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ھو مبتدا ہو اور أحق خبر ہو۔ یہ قسم ہے۔ اِنَّهٗ لَحَقٌّ یہ جواب قسم ہے، یعنی بے شک یہ ہونے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 141

یعنی تم اس کے عذاب اور اس کے بدلے سے بچ نہیں سکتے۔

وَ لَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ۗ وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۵۴

"اور اگر ہر ظالم شخص کے لیے روئے زمین کی دولت ہو تو بھی وہ ساری دولت بطور فدیہ دے دے۔ اور وہ ظالم دل ہی دل میں پچھتانے لگے جب دیکھا انہوں نے عذاب کو اور فیصلہ کر دیا گیا ان کے درمیان انصاف سے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا"۔

قولہ تعالیٰ: **وَ لَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ** یعنی اگر ہر شخص کے لیے جس نے شرک کیا اور کفر کیا۔ **مَا فِي الْاَرْضِ** یعنی وہ سب اس کی ملکیت ہو جو زمین میں ہے۔ **لَافْتَدَتْ بِهٖ** وہ ساری دولت اللہ تعالیٰ کے عذاب کے بدلے فدیہ دے دے، تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى** (آل عمران: 91) (جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے کفر ہی کی حالت میں تو ہرگز قبول نہ کیا جائے گا ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا اگرچہ وہ (اپنی نجات کے لیے) عوضانہ دے اتنا سونا) اور یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: **وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ** یعنی انہوں نے ندامت کو مخفی رکھا، یعنی ان کے سرداروں نے۔ مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ندامت کو اپنے تبعین سے چھپا کر رکھا(1)۔ **لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ** (جب انہوں نے عذاب کو دیکھا) اور یہ آگ میں جلائے جانے سے پہلے ہے۔ اور جب وہ جہنم میں واقع ہوں گے تو آگ انہیں ایسا کرنے سے غافل کر دے گی۔ اس کی دلیل ان کا یہ قول ہے: **رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا** (المومنون: 106) (اے ہمارے رب! غالب آ گئی تھی ہم پر ہماری بدبختی) پس ظاہر ہو گیا کہ وہ اسے نہیں چھپا سکیں گے جو انہیں لاحق ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اسرّوا بمعنی اظہروا (یعنی وہ ظاہر کر دیں گے) اور یہ کلمہ اضداد میں سے ہے اور اس پر دلیل یہ بھی ہے کہ آخرت مضبوطی اور صبر دکھانے کا دار نہیں ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اپنے دلوں میں حسرت کا درد پانے لگے، کیونکہ ندامت کو ظاہر کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کثیر نے کہا ہے:

فاسررت الندامۃ یوم نادی برد جمال غاضرۃ المنادی

اور مبرد نے اس میں ایک تیسری وجہ ذکر کی ہے کہ ان کے چہروں کے خطوط ندامت کو ظاہر کر دیں اور یہ پیشانی کی لکیریں (اور خدوخال) ہیں، اور اسرّہ کا واحد سرار ہے۔ اور ندامت سے مراد وہ حسرت ہے جو کسی شے کے واقع ہونے یا فوت ہونے کی وجہ سے ہو۔ اور اس کا اصل معنی تو لازم ہوتا ہے۔ اور اسی سے ندیم ہے کیونکہ وہ مجالس کو لازم پکڑتا ہے۔ اور فلان نادم سادم (فلاں نادم اور غمگین ہے)

اور السدم اللھج بالشئی (سدم کا معنی شیفتہ ہونا ہے) اور ندم و تندم بالشئی یعنی کسی شی کے سبب غمگین ہوا۔ جوہری نے کہا ہے: السّدم کا معنی ندامت اور حزن ہے۔ اور سدِم کسرہ کے ساتھ ہو تو معنی غمگین ہونا اور پریشان ہونا ہے۔ اور رجل

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 438

نادم سادم، وندمان سدمان۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس (نادم) کے تابع ہے اور ماله هم ولا سدم الا ذالك یعنی اس کے لیے نہ کوئی غم ہے نہ پریشانی سوائے اس کے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الندم الدمن کا مقلوب ہے۔ اور الدمن کا معنی لازم ہونا ہے۔ اور اس سے ہی فلان مدمن الخمر فلاں شراب کو لازم پکڑنے والا ہے یعنی ہمیشہ شراب پینے والا ہے) اور الدمن سے مراد وہ شے ہے جو گھر میں جمع ہو اور تلبّد من الأبوال والأبعار (اور بول و براز اور گوبر (کھاد) جمع ہو گیا) اس کے لازم ہونے کی وجہ سے اسے یہ نام دیا گیا ہے۔ اور الدّمنة اس سے مراد وہ کینہ ہے جو سینے کو لازم پکڑے ہوتا ہے۔ اور اس کی جمع دمن ہے۔ اور قد دَمِنتِ قلوبهم (ان کے دل کینے سے بھر گئے) کہا جاتا ہے: دَمِنتُ علی فلان ای ضَغِنتُ (یعنی میں نے فلاں کے لیے کینہ رکھا)۔ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ یعنی رؤسا اور ادنی لوگوں کے درمیان عدل سے فیصلہ کر دیا گیا۔ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

''سن لو! بے شک اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں، سن لو! یقیناً اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے''۔

اَلَاۤ سامع کے لیے یہ حرف تنبیہ ہے یہ کلام کے اوّل میں زائد کیا جاتا ہے، یعنی تم ان کے بارے آگاہ ہو جاؤ جو میں تمہیں کہہ رہا ہوں۔ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (بے شک اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں سن لو! یقیناً اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے) لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (البقرہ: 107) (آسمانوں اور زمین میں اسی کی بادشاہی ہے) اور کوئی مانع نہیں جو اسے اپنے وعدہ کو نافذ کرنے سے روک سکے (1)۔ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾

''وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی مارتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے''۔

اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ۬ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾

''اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے پروردگار کی طرف سے اور (آ گئی ہے) شفا ان روگوں کے لیے جو سینوں میں ہیں اور (آ گئی ہے) ہدایت اور رحمت اہل ایمان کے لیے''۔

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 259

قولہ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ مراد قریش ہیں۔ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ اس میں موعظة کا معنی نصیحت ہے۔ مِّنْ رَّبِّكُمْ (تمہارے پروردگار کی طرف سے) یعنی قرآن کریم جس میں نصیحتیں اور حکمت آموز باتیں ہیں۔ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ اور (آگئی ہے) ان روگوں سے شفا جو شک، نفاق، اختلاف اور افتراق میں سے سینوں میں ہیں۔ وَ هُدًى ی اور ان کے لیے رشد وہدایت جنہوں نے اس کی اتباع اور پیروی کی۔ وَّ رَحْمَةٌ اور رحمت ونعمت لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (اہل ایمان کے لیے) انہیں خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ یہی ایمان کے ساتھ نفع حاصل کرتے ہیں۔ اور یہ تمام قرآن کی صفات ہیں اور عطف مدح کی تاکید کے لیے ہے، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

إلی المَلِكِ القَرْمِ و ابنِ الهُمامِ وليثِ الكَتِيبة في المُزْدَحَمْ

اس میں بھی یہ تمام صفات بادشاہ کی ہیں اور عطف برائے تاکید ہے۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾

"(اے حبیب!) آپ فرمائیے یہ کتاب محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے نازل ہوئی ہے پس چاہیے کہ اس پر خوشی منائیں، یہ بہتر ہے ان تمام چیزوں سے جن کو وہ جمع کرتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ فضل اللہ سے مراد قرآن کریم اور رحمت سے مراد اسلام ہے۔ اور انہی دونوں سے یہ بھی روایت ہے کہ فضل اللہ سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور رحمت سے مراد یہ ہے کہ اس نے تمہیں اس کے اہل بنایا (1)۔ اور حضرت حسن، ضحاک، مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے: فضل اللہ سے مراد ایمان ہے اور رحمتہ سے مراد قرآن ہے (2)، یہ پہلے قول کے برعکس ہے۔ اس کے علاوہ بھی قول کیے گئے ہیں۔ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا یہ اشارہ فضل اور رحمت کی طرف ہے۔ اور عرب، ذالك کو واحد، تثنیہ اور جمع کے لیے بطور اشارہ لاتے رہتے ہیں۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فبذالك فلتفرحوا تا کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور یہ یزید بن قعقاع اور یعقوب وغیرہ کی قراءت ہے۔ اور حدیث میں ہے۔ لتأخذوا مصافکم (3) (چاہیے کہ تم اپنی صفوں میں رہو) اور الفرح سے مراد لذة فی القلب بادراك المحبوب (وہ لذت ہے جو محبوب کے ملنے سے دل میں محسوس ہوتی ہے) اور کئی مقامات پر فرح (خوشی) کی مذمت بیان کی گئی ہے، مثلاً قول باری تعالیٰ ہے: لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ ﴿۷۶﴾ (القصص) (زیادہ خوش نہ ہو بے شک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا اترانے والوں کو) اور اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿۱۰﴾ (ہود) (بے شک وہ بڑا خوش ہونے والا اترانے والا ہے) لیکن یہ مطلق ہے اور فرحت کو مقید کر دیا جائے تو وہ مذموم نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا ارشاد ہے: فَرِحِیْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (آل عمران: 170) (شاد ہیں ان (نعمتوں) سے جو عنایت فرمائی ہیں انہیں اللہ نے اپنے فضل وکرم سے) اور یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا یعنی قرآن

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 144 2۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 164

3۔ جامع ترمذی، باب من سورۃ ص، حدیث نمبر 3159، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اسلام کے ساتھ چاہیے کہ وہ خوشی منائیں، پس یہ مقید ہے۔

ہارون نے کہا ہے: حضرت ابی کی قراءت میں فبذالك فافرحوا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: امر کا طریقہ یہ ہے کہ وہ لام کے ساتھ ہوتا کہ اس کے ساتھ حرف جازم ہو جیسا کہ نہی کے ساتھ حرف ہوتا ہے، مگر وہ امر سے مخاطب کے لیے حذف کر دیتے ہیں کیونکہ اس کے خطاب کے سبب اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور بسا اوقات وہ اسے اپنے اصل کے مطابق لے آتے ہیں۔ اور اسی سے فبذالك فلتفرحو ہے۔

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ یعنی یہ ان چیزوں سے بہتر ہے جو وہ دنیا میں جمع کرتے ہیں۔ دونوں فعلوں میں عام قراءت یا کے ساتھ ہے۔ اور ابن عامر سے روایت ہے کہ انہوں نے فلیفرحوا یا کے ساتھ اور تجمعون تا کے ساتھ پڑھا ہے(1)۔ اس لیے کہ یہ خطاب کافروں کو ہے۔ اور حضرت حسن سے روایت ہے کہ انہوں نے پہلے میں تا کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور يَجْمَعُوْنَ میں یا کے ساتھ یعنی پہلے قول کا برعکس ہے۔ اور ابان نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جسے اللہ تعالیٰ نے اسلام کی ہدایت عطا فرمائی اور قرآن کریم کا علم سکھایا پھر وہ فاقہ کی شکایت کرے اللہ تعالیٰ اس کی آنکھوں کے درمیان فقر لکھ دے گا اس دن تک جس میں وہ اسے ملے گا"۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی...... قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (من هداه الله الإسلام و علمه القرآن ثم شكا الفاقة كتب الله الفقر بين عينيه الى يوم يلقاه)(2)

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ۭ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝

"آپ فرمایئے بھلا بتاؤ تو جو رزق اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اتارا پس بنا لیا ہے تم نے اس سے بعض کو حرام اور بعض کو حلال، پوچھیے کیا اللہ تعالیٰ نے (ایسا کرنے کی) تمہیں اجازت دی ہے یا تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو"۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ اَرَءَيْتُمْ یہ کفار مکہ کو خطاب ہو رہا ہے۔ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ اس میں ما محل نصب میں ہے، أرايتم کے سبب۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ أنزل کے سبب محل نصب میں ہے۔ اور أنزل بمعنی خلق ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ (الزمر: 6) (اور پیدا کیے تمہارے لیے جانوروں میں سے آٹھ جوڑے) اور وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ (الحدید: 25) (اور ہم نے پیدا کیا ہے لوہے کو اس میں بڑی قوت ہے) پس یہ بھی جائز ہے کہ خلق کو انزال کے ساتھ اس لیے تعبیر کیا گیا ہو کیونکہ زمین میں جو بھی رزق ہے وہ وہی ہے جو آسمان سے بارش کے سبب نازل ہوتا ہے۔ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ وہ ہے جو انہوں نے بحیرہ،

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 164 2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 439۔ تفسیر در منثور

سائبہ، وصیلہ اور حام کی تحریم کے بارے حکم لگایا۔ اور حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِیْبًا (الانعام: 136) (اور انہوں نے بنا رکھا ہے اللہ کے لیے اس سے جو پیدا فرماتا ہے فصلوں اور مویشیوں سے مقررہ حصہ) قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ پوچھیے کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں حلال و حرام کرنے کی اجازت دی ہے۔ اَمْ عَلَى اللّٰهِ اس میں ام بمعنی بل ہے۔ تَفْتَرُوْنَ یہ ان کا قول ہے بے شک اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے (یعنی یہ کہہ کر تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ رہے ہو)

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت سے قیاس کی نفی کے بارے استدلال کیا گیا ہے اور یہ بعید (از حقیقت) ہے کیونکہ قیاس اللہ تعالیٰ کی دلیل ہے، پس تحریم و تحلیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے ایسی دلیل کے پائے جانے کے وقت جو اللہ تعالیٰ نے حکم پر قائم کی ہے، پس اگر کوئی قیاس کے اللہ تعالیٰ کی دلیل ہونے میں اختلاف کرے تو یہ اس غرض (اور مقصد) سے خروج ہے اور اس کے غیر کی طرف رجوع ہے۔

وَ مَا ظَنُّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿٦٠﴾

”اور کیا گمان ہے ان لوگوں کا جو افتراء کرتے ہیں اللہ تعالیٰ پر جھوٹا کہ قیامت کے دن ان کا کیا حال ہوگا، بے شک اللہ تعالیٰ فضل و کرم فرماتا ہے لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے“۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا ظَنُّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اس میں یوم ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے یا ظن کی وجہ سے جیسا کہ ما ظننك زیدا ہے اور اس کا معنی ہے کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے ان کا مواخذہ نہیں فرمائے گا (1)۔ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ بے شک اللہ تعالیٰ (اس میں) تاخیر کر کے اور مہلت دے کر لوگوں پر فضل و کرم فرماتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے اہل مکہ کا ارادہ کیا ہے جس وقت انہیں حرم پاک میں پرامن بنا دیا۔ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ یعنی کفار لَا یَشْكُرُوْنَ اللہ تعالیٰ کا اس کی نعمتوں پر شکر ادا نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے سے عذاب کو موخر کرنے میں (اس کا شکر ادا کرتے ہیں)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لایشکرون کا معنی ہے لایوحدون یعنی اس کی وحدانیت کا اقرار نہیں کرتے۔

وَ مَا تَكُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّ مَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّ لَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَیْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ ؕ وَ مَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ وَ لَاۤ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَ لَاۤ اَكْبَرَ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ﴿٦١﴾

”اور نہیں ہوتے آپ کسی حال میں اور نہ آپ تلاوت کرتے ہیں اس حال میں کچھ قرآن اور (اے لوگو!) نہ تم کچھ عمل کرتے ہو مگر (ہر حال میں) ہم تم پر گواہ ہوتے ہیں جب بھی تم شروع ہوتے ہو کسی کام میں۔ اور

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 165

نہیں چھپا ہوتا آپ کے رب سے ذرہ برابر بھی زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہیں کوئی چھوٹی چیز اس ذرہ سے اور نہ بڑی مگر وہ روشن کتاب (لوح محفوظ) میں ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ اس میں مابرائے انکار ہے، یعنی آپ کسی حال میں نہیں ہوتے، مراد یہ کہ چاہے وہ عبادت کی حالت ہو یا اس کے سوا کی مگر اللہ تعالیٰ آپ پر مطلع ہے۔ شان حالت اور امر (کام) کو کہتے ہیں اس کی جمع شئون ہے۔ اخفش نے کہا ہے: عرب کہتے ہیں: ما شأنت شأنه یعنی میں نے اس کا کام نہیں کیا (ما عملت عمله)، وَّ مَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ فراء اور زجاج نے کہا ہے: منہ کی ہا ضمیر شان کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی آپ جو نیا کام کرتے ہیں پھر اس کی وجہ سے قرآن کریم پڑھا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کا حکم کیا ہے یا اس بارے میں قرآن کریم نازل ہوتا ہے اور اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے: منہ سے مراد من کتاب اللہ تعالیٰ ہے(1) (یعنی نہ آپ تلاوت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے) مِنْ قُرْاٰنٍ تفخیم شان کے لیے اس کا دوبارہ ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ اس قول میں ہے: اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ (القصص: 30) (بے شک میں اللہ ہوں) وَّ لَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اللہ تعالیٰ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو خطاب فرما رہا ہے: (اور نہ تم کچھ عمل کرتے ہو)

اور قول باری تعالیٰ: وَ مَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ یہ خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن مراد آپ اور آپ کی امت ہے۔ اور کبھی خطاب رسول کو کیا جاتا ہے اور مراد وہ اور اس کے متبعین ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہاں مراد کفار قریش ہیں۔ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا (مگر ہر حال میں ہم تم پر گواہ ہوتے ہیں) یعنی ہم اسے جانتے ہیں، اور اس کی نظیر یہ ارشاد ہے۔ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ (المجادلہ: 7) (نہیں ہوتی کوئی سرگوشی تین آدمیوں میں مگر وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے)

اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ یعنی جب تم اس میں شروع ہوتے ہو۔ فیہ میں ہا ضمیر عمل کی طرف لوٹ رہی ہے۔ کہا جاتا ہے: أفاض فلان فی الحدیث والعمل جب وہ بات اور کام میں لگ جائے۔ الراعی کا قول ہے:

فأفضن بعد كظومهن بجرة من ذي الأباطح إذ رعين حقيلا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ، تفعلونه (جب تم اس میں داخل ہوتے ہو) ابن کیسان نے کہا ہے: تنتشرون القول (جب تم بات مشہور کرتے ہو)۔ اور ضحاک نے کہا ہے: ہا ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے، اس کا معنی ہوگا: جب تم قرآن میں جھوٹ ملاتے ہو۔

وَ مَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: آپ کے رب سے غیب نہیں ہوتا(2)۔ اور ابوروق نے کہا ہے: آپ کے رب سے دور نہیں ہوتا۔ اور ابن کیسان نے کہا ہے: وہ آپ کے رب سے جا نہیں سکتا۔ اور کسائی نے یعزب زا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جہاں واقع ہوا ہے اور باقیوں نے عین کلمہ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں فصیح لغتیں ہیں، جیسے یَعْرِشُ اور یَعْرُشُ ہے۔

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 149
2۔ ایضاً، جلد 11، صفحہ 151

مِنْ مِّثْقَالِ اس میں من صلہ ہے۔ ذرۃ یعنی ذرے کا وزن۔ مراد یہ ہے کہ آپ کے رب سے ذرے کے وزن کے برابر بھی کوئی شی مخفی اور چھپی ہوئی نہیں، یعنی سرخ رنگ کی چھوٹی سی چیونٹی کے برابر بھی۔ اور سورۃ النساء میں یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اس کا عطف لفظ مثقال پر ہے اور اگر چاہیں تو ذرہ پر کر لیں۔

اور یعقوب اور حمزہ نے دونوں میں را کو رفع کے ساتھ مثقال کے محل پر عطف کرتے ہوئے پڑھا ہے کیونکہ من زائدہ تاکید کے لیے ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: مبتدا ہونے کی بنا پر رفع بھی جائز ہے اور اس کی خبر اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ہے۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہونے کے ساتھ لوح محفوظ میں بھی ہے۔ علامہ جرجانی نے کہا ہے: اِلَّا واؤ نسق کے معنی میں ہے یعنی وھو فی کتاب مبین (اور وہ لوح محفوظ میں ہے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ (النمل) ای و من ظلم (میرے حضور ڈرا نہیں کرتے جنہیں رسول بنایا جاتا ہے مگر وہ شخص جو زیادتی کرے (وہ ڈرے) اور قول باری تعالیٰ: لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ (البقرہ:150) ای والذین ظلموا منھم (تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم پر اعتراض (کی گنجائش) بجز ان لوگوں کے جو ناانصافی کریں ان سے) پس الا بمعنی واؤ نسق ہے، اور اس کے بعد ھو مضمر ہے۔ جیسا کہ یہ ارشاد ہے: وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ (البقرہ:58) ای ھی حطۃ (اور کہتے جانا بخش دے (ہمیں)

اور قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ (النساء:171) ای ھم ثلاثۃ (اور نہ کہو تین خدا ہیں) اور اس کی نظیر اس میں بھی ہے جس میں ہم ہیں: وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ (الانعام) ای وھو فی کتاب مبین (اور نہیں گرتا کوئی پتا مگر وہ جانتا ہے اس کو اور نہیں کوئی دانہ زمین کے اندھیروں میں اور نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک چیز مگر وہ لکھی ہوئی ہے روشن کتاب میں)

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

"سنو! بے شک اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے"۔

قولہ تعالیٰ: اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ یعنی بے شک آخرت میں اولیاء اللہ کو کوئی خوف نہیں۔ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور نہ وہ دنیا کے مفقود ہونے کی وجہ سے غمگین ہوں گے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ یعنی جس کا والی اللہ تعالیٰ ہو اور اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کی ذمہ داری اس نے لی ہوئی ہو اور وہ اس سے راضی اور خوش بھی ہو تو قیامت کے دن نہ اسے خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا ..... یعنی جہنم سے۔ مُبْعَدُوْنَ ۝ تا قولہ..... لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ (الانبیاء:103) (بلاشبہ وہ لوگ جن کے لیے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ وہ اس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے اور وہ ان (نعمتوں) میں جن کی خواہش انہوں نے کی تھی ہمیشہ رہیں گے نہ غمناک کرے گی انہیں وہ بڑی گھبراہٹ)

اور حضرت سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: اولیاء اللہ کون ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: الذین یذکر اللہ برؤیتھم (یعنی وہ جنہیں دیکھنے سے اللہ تعالیٰ کی یاد آجاتی ہے) اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی (وضاحت) میں فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کچھ بندے ایسے ہیں جو نہ انبیاء ہیں اور نہ شہداء ہیں (لیکن) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کے مرتبے کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام اور شہداء ان پر رشک کریں گے''۔

عرض کی گئی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہمیں خبر دیجئے وہ کون ہیں اور ان کے اعمال کیا ہیں تاکہ ہم ان سے محبت کرنے لگ جائیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ ایسی قوم ہے جو آپس میں نسبی رشتہ داری کے بغیر اور ایسے مالوں کے بغیر جن کے سبب وہ ایک دوسرے سے مہربانی کرتے ہوں محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ قسم بخدا! بے شک ان کے چہرے نور ہوں گے اور بلاشبہ وہ نور کے منبروں پر ہوں گے وہ خوفزدہ نہیں ہوں گے جب لوگوں کو خوف ہوگا اور وہ غمگین نہیں ہوں گے جب لوگ غمزدہ ہوں گے''۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (1) اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اولیاء اللہ ایسی قوم ہے جن کے چہرے جاگنے کے سبب زرد ہوں، آنسوؤں کے سبب آنکھیں کمزور ہوں، بھوک کے سبب پیٹ دبلے اور خالی ہوں اور ان کے ہونٹ گرمی یا پیاس کے سبب خشک ہوں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ یعنی انہیں اپنی اولاد کے بارے میں کوئی خوف نہ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور نہ انہیں اپنی دنیا پر کوئی غم ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں عوض عطا فرما دیتا ہے ان کے پہلوں میں بھی اور ان کے پچھلوں میں بھی کیونکہ وہ ان کا ولی اور ان کا مددگار ہے۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾

''یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور (عمر بھر) پرہیزگاری کرتے رہے''۔

یہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء کی صفت ہے پس الَّذِيْنَ، اِنَّ کے اسم سے بدل ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور وہ اولیاء ہے اور اگر چاہیں تو اس سے پہلے اعنی مقدر مان لیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر: لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ہے پس اس طرح یہ (ترکیبی اعتبار سے) ماقبل سے کٹ جائے گا، یعنی وہ جو شرک اور گناہوں سے بچتے ہیں۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۴﴾

''انہیں کے لیے بشارت ہے دنیوی زندگی میں اور آخرت میں، نہیں بدلتیں اللہ تعالیٰ کی باتیں یہی بڑی کامیابی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''جب سے یہ آیت نازل ہوئی ہے تیرے سوا کسی نے اس کے بارے مجھ سے نہیں پوچھا، یہ سچے خواب ہیں جنہیں ایک مسلمان دیکھتا ہے یا اسے دکھائے جاتے ہیں'' (2)۔ اسے

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الرحم، حدیث نمبر 3060، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 138

ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جامع میں ذکر کیا ہے۔ اور زہری، عطا اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: بشارت سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ ملائکہ دنیا میں موت کے وقت ایک مومن کو خوشخبری دیتے ہیں۔ اور محمد بن کعب قرظی سے روایت ہے انہوں نے کہا: جب بندہ مومن کی روح نکلنے کے ارادہ سے جمع ہو جائے اس کے پاس ملک الموت علیہ السلام آتے ہیں اور کہتے ہیں: السلام علیك ولی اللہ اللہ یقرئك السلام (1) (اے اللہ تعالیٰ کے دوست (ولی) تجھ پر سلام ہو اللہ تعالیٰ تجھے سلام فرمارہا ہے) پھر وہ اس آیت کے ساتھ نکال لیتے ہیں: الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ (النحل: 32) (وہ متقی جن کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ خوش ہوتے ہیں (اس وقت) فرشتے کہتے ہیں (اے نیک بختو!) سلامتی ہو تم پر۔ اسے ابن مبارک نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت قتادہ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہما نے کہا: بشارت یہ ہے کہ وہ موت سے پہلے جان لیتا ہے کہ وہ کہاں ہوگا۔

اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہی بشارت ہے جو اللہ تعالیٰ انہیں اپنی کتاب میں جنت اور عظیم ثواب کے بارے عطا فرما دیتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے: يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ (التوبہ: 21) (خوشخبری دیتا ہے انہیں ان کا رب اپنی رحمت اور اپنی خوشنودی کی) مزید ارشاد ہے: وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ (البقرہ: 25) (اور خوشخبری دیجئے انہیں جو ایمان لائے اور کیے نیک عمل (کہ) یقیناً ان کے لیے باغات ہیں) مزید فرمایا: وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ (فصلت) (تمہیں بشارت ہو جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے) اور اسی لیے ارشاد فرمایا: لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ یعنی اس کے وعدوں کے خلاف نہیں ہو سکتا اور یہ اس لیے ہے کیونکہ اس کے وعدے اس کے کلمات ہیں۔

وَفِي الْاٰخِرَةِ کہا گیا ہے: آخرت میں جنت کے بارے بشارت ہوگی جب وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے۔ اور بعض نے کہا ہے: جب روح نکلتی ہے تو انہیں اللہ تعالیٰ کی رضا کی بشارت دی جاتی ہے۔ اور ابو اسحاق ثعلبی نے ذکر کیا ہے: میں نے ابوبکر محمد بن عبد اللہ جوزقی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: میں نے ابو عبد اللہ الحافظ کو خواب میں ترکی گھوڑے پر سوار دیکھا وہ اپنے اوپر کمبل لیے ہوئے اور عمامہ باندھے ہوئے تھے، میں نے انہیں سلام کیا اور انہیں کہا: خوش آمدید، بے شک مسلسل تمہارا ذکر کرتے رہتے ہیں اور تمہارے محاسن اور خوبیاں بیان کرتے رہتے ہیں، تو انہوں نے کہا: اور ہم بھی تمہارا ذکر کرتے ہیں اور تمہاری خوبیاں بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (ان کے لیے) اچھی تعریف ہے اور اپنے ہاتھ کے ساتھ اشارہ بھی کیا۔ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ یعنی اس کے وعدہ کے خلاف نہیں ہو سکتا (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی خبریں تبدیل نہیں ہوتیں، یعنی وہ انہیں کسی شے کے ساتھ منسوخ نہیں کرتا اور وہ نہیں ہوتیں مگر اسی طرح جیسے وہ فرمائے۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ یعنی جس مقام پر اولیاء اللہ ہوں گے وہی عظیم کامیابی ہے۔

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۭ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝٦٥

1۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 361، حدیث نمبر 402 (بتغیر قلیل)
2۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 168

''اور نہ غمزدہ کریں آپ کو ان کی باتیں یقیناً ساری عزت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے وہ سب کچھ سننے والا ہر چیز جاننے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ کلام مکمل ہو گئی، یعنی ان کا افترا باندھنا اور ان کا آپ کو جھٹلانا آپ کو غمزدہ نہ کرے، پھر کلام کا آغاز کیا اور فرمایا: اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ یعنی بے شک قوت کاملہ، غلبہ شاملہ اور قدرت تامہ صرف اللہ وحدہ لاشریک کے لیے ہے پس وہی آپ کا ناصر، مددگار اور محافظ ہے۔ جَمِیْعًا یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول اس کے معارض نہیں ہے۔ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ (المنافقون: 8) (حالانکہ (ساری) عزت تو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے، اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے ہے) کیونکہ تمام عزتیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہیں اور وہ تمام کی تمام اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ (الصافات) پاک ہے آپ کا رب جو عزت کا مالک ہے ان (ناسزا باتوں سے) جو وہ کیا کرتے ہیں) هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وہ ان کی باتیں اور ان کی آوازیں سننے والا ہے اور ان کے اعمال، ان کے افعال اور ان کی جمیع حرکات کو جاننے والا ہے۔

اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ ؕ وَ مَا یَتَّبِعُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾

''خبردار! بے شک اللہ کے ملک میں ہے جو کوئی آسمان میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے اور کس کی پیروی کر رہے ہیں جو لوگ پکار رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا (دوسرے) شریکوں کو؟ نہیں پیروی کر رہے مگر وہم وگمان کی اور نہیں وہ مگر اٹکلیں دوڑا رہے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یعنی (بے شک جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ملک میں ہے) وہ ان کے بارے میں اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے جو وہ ارادہ فرماتا ہے اور ان میں وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا یَتَّبِعُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ اس میں مَا نفی کے لیے ہے، یعنی وہ حقیقۃً دوسرے شریکوں کی پیروی نہیں کرتے ہیں، بلکہ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ شفاعت کریں گے یا نفع دیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مَا استفہامیہ ہے، یعنی کون سی شی ہے جس کی وہ پیروی کر رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے شریکوں کو پکار رہے ہیں (1)۔ (یہ) ان کے فعل کی قباحت (اور برائی) بیان کرنے کے لیے ہے، پھر جواب دیا اور فرمایا: اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ یعنی وہ محض تخمینے لگا رہے ہیں اور جھوٹ بول رہے ہیں، اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾

''وہی ہے جس نے بنائی تمہارے لیے رات تاکہ تم آرام کرو اس میں اور روشن دن بنایا بے شک اس میں

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 169

نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سنتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَكُمُ الَّیۡلَ لِتَسۡكُنُوۡا فِیۡهِ یہ بیان فرمایا کہ واجب اس کی عبادت ہے جو رات اور دن کو پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے جو اس چیز پر قدرت نہیں رکھتا وہ عبادت کے لائق نہیں۔ لِتَسۡكُنُوۡا فِیۡهِ تا کہ تم اس میں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کے ساتھ آرام کرو تا کہ تم سے تھکاوٹ اور سستی زائل ہو جائے۔ اور سکون سے مراد اضطراب اور پریشانی سے پر سکون ہونا ہے، آرام پانا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَالنَّهَارَ مُبۡصِرًا اور دن کو روشن بنایا تا کہ تم اس کے ساتھ اپنی حوائج وضروریات میں ہدایت اور رہنمائی پا سکو اور المبصر وہ ہوتا ہے جو دیکھنے والا ہو، اور دن میں دیکھا جاتا ہے۔ اور فرمایا: مُبۡصِرًا یہ مجازا ہے اور عربوں کی عادت کے مطابق اس میں یہ وسعت ہے جیسا کہ ان کا قول ہے، لیل قائم (رات قیام پذیر ہے) اور نہار صائم (اور دن روزے دار ہے) اور جریر نے کہا ہے:

لقد لُمۡتِنا یا أمَّ غَیۡلان فی السُّریٰ ونمتِ وما لیلُ المطِیِّ بنائم(1)

اور قطرب نے کہا ہے: کہا جاتا ہے أظلم اللیل یعنی رات تاریکی والی ہو گی۔ (صار ذا ظلمة) اور أضاء النهار و أبصر (دن روشن اور دیکھنے والا ہو گیا) أی صار ذا ضیاء و بصر۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ بے شک اس میں علامات اور دلائل ہیں۔ لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ یعنی ان لوگوں کے لیے جو گہری غور وخوض سے سنتے ہیں۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبۡحٰنَهٗ ؕ هُوَ الۡغَنِیُّ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ اِنۡ عِنۡدَكُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۸﴾

"انہوں نے کہا بنا لیا ہے الله تعالیٰ نے کسی کو بیٹا، وہ پاک ہے۔ وہ تو بے نیاز ہے، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، نہیں تمہارے پاس کوئی دلیل اس (بیہودہ بات) کی، کیا بہتان باندھتے ہو الله تعالیٰ پر جس کا تمہیں علم ہی نہیں"۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا یعنی کافروں نے کہا: الله تعالیٰ نے کسی کو بیٹا بنا لیا۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ سُبۡحٰنَهٗ اس نے اپنے آپ کو بیوی اور اولاد سے اور شرکاء اور مد مقابل الٰہوں سے پاک رکھا ہوا ہے۔ هُوَ الۡغَنِیُّ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ پھر الله تعالیٰ نے اپنے مطلق غنی اور بے نیاز ہونے کی خبر دی اور یہ کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اس کی ملک، اس کی مخلوق اور اس کی غلام ہے: اِنۡ كُلُّ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا ﴿۹۳﴾ (مریم)

اِنۡ عِنۡدَكُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍۭ بِهٰذَا یعنی تمہارے پاس اس بیہودہ بات پر کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے۔ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ الله تعالیٰ کے لیے بیٹے کو ثابت کر کے (کیا تم اس پر بہتان باندھتے ہو جس کا تمہیں علم ہی نہیں) کیونکہ بیٹا تو

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 130

مجانست اور مشابہت کا تقاضا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نہ کسی شے سے مجانست رکھتا ہے اور نہ کسی شے سے مشابہت رکھتا ہے۔

قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِیْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

''آپ فرمایئے جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ (چند روزہ) لطف اندوزی ہے دنیا میں پھر ہماری طرف ہی انہیں لوٹنا ہے پھر ہم چکھائیں گے انہیں سخت عذاب بوجہ اس کے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ یعنی بے شک وہ جھوٹ گھڑتے ہیں۔ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ یعنی نہ وہ کامیاب ہو سکتے ہیں اور نہ پرامن ہو سکتے ہیں، کلام مکمل ہوئی۔ مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا یعنی ذالك متاع او هو متاع فی الدنیا (یہ دنیا میں (چند روزہ) لطف اندوزی ہے) یہ کسائی نے کہا ہے اور اخفش نے کہا ہے: لهم متاع فی الدنیا (ان کے لیے لطف اندوزی ہے دنیا میں) ابو اسحاق نے کہا ہے: قرآن کے علاوہ (دوسری عبارت میں) نصب پڑھنا بھی جائز ہے معنی یہ ہوگا یتمتعون متاعا (وہ لطف اندوز ہو رہے ہیں دنیا میں) ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ پھر ہماری طرف ان کا رجوع ہے۔ ثُمَّ نُذِیْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ پھر ہم انہیں انتہائی سخت عذاب چکھائیں گے۔ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ یعنی ان کے کفر کے سبب۔

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَیْكُمْ مَّقَامِیْ وَتَذْكِیْرِیْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْۤا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَیْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْۤا اِلَیَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾

''اور آپ پڑھ سنایئے انہیں نوح (علیہ السلام) کی خبر جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! اگر گراں ہے تم پر میرا قیام اور میرا پند و نصیحت کرنا اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے پس (سن لو) میں نے اللہ تعالیٰ پر توکل کر لیا سو تم بھی کوئی متفقہ فیصلہ کر لو اپنے شریکوں سے مل کر پھر نہ ہو تمہارا یہ فیصلہ تم پر مخفی پھر کر گزرو میرے ساتھ (جو جی میں آئے) اور مجھے مہلت نہ دو''۔

قولہ تعالیٰ: وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ آپ ان کے سامنے پہلے لوگوں کے قصے اور واقعات بیان فرمائیں اور انہیں کفر اختیار کرنے پر دردناک عذاب سے ڈرائیں (اور خوفزدہ کریں) اتل میں واؤ کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ امر ہے، یعنی آپ ان پر حضرت نوح علیہ السلام کی خبر پڑھ کر بیان کریں۔ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ اس میں اذ محل نصب میں ہے۔ یٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَیْكُمْ یعنی اگر تم پر بھاری اور ثقیل ہے۔ مَّقَامِیْ، المقام (میم کے فتحہ کے ساتھ ہو) تو معنی وہ جگہ ہے جس میں قیام ہوتا ہے۔ اور المقام (میم کے ضمہ کے ساتھ ہو) تو معنی الاقامة (قیام کرنا ہوتا ہے)۔ اور جہاں تک مجھے علم ہے اس کے ساتھ نہیں پڑھا گیا، یعنی اگر تم میں میرا ٹھہرنا تم پر گراں ہے۔ وَتَذْكِیْرِیْ اور

تمہیں میرا پندونصیحت کرنا اور تمہیں میرا ڈرانا۔ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (اللہ تعالیٰ کی آیات سے) اور تم نے میرے قتل کا اور مجھے بھگانے کا ارادہ کرلیا ہے(1)۔ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ تو میں نے اللہ پر اعتماد کرلیا۔ اور یہ جواب شرط ہے۔ اور آپ علیہ السلام تو ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور توکل کرتے رہے، لیکن یہاں خاص طور پر بیان فرمایا کہ وہ متوکل ہیں تا کہ ان کی قوم جان لے کہ اللہ تعالیٰ ان کے معاملہ میں آپ کے لیے کافی ہوگا، یعنی اگر تم میری مدد نہیں کرو گے تو میں بلاشبہ اس پر اعتماد اور توکل کرتا ہوں جو میری مدد کرے گا۔

قولہ تعالیٰ: فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ عام قرات میں فاجمعوا ہمزہ قطعی کے ساتھ ہے اور شرکاءکم منصوب ہے اور عاصم جحدری نے فاجمعوا ہمزہ وصلی اور میم کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے یہ جمع یجمع سے ماخوذ ہے اور شرکاءکم نصب کے ساتھ ہے۔ اور حسن، ابن اسحاق اور یعقوب نے فاجمعوا کو ہمزہ قطعی کے ساتھ اور شرکاءکم کو مرفوع پڑھا ہے۔ پس پہلی قرات أجمع علی الشئ سے ہے جب کوئی اس کا عزم کرلے۔ اور فراء نے کہا ہے: أجمع الشئ کا معنی ہے اس نے اسے تیار کیا۔ اور مورج نے کہا ہے: أجمعت الأمر، أجمعت علیه سے زیادہ فصیح ہے۔ اور یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

یا لیت شعری والمُنَی لا تنفع　　هل أَغْدُوَنْ یوما و امری مُجْمَعُ

نحاس نے کہا ہے: اس قراءت کے مطابق شرکاء کی نصب میں تین وجہیں ہیں: کسائی اور فراء نے کہا ہے: یہ بمعنی وادعوا شرکاءکم لنصرتکم ہے (اور تم اپنے شریکوں کو اپنی مدد کے لیے بلالو) ان دونوں کے نزدیک اس فعل مضمر کے ساتھ اسے نصب دی گئی ہے۔ اور محمد بن یزید نے کہا ہے: یہ معنی پر معطوف ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

یا لیت زوجَكِ فی الوَغَی　　متقلّداً سیفاً و رُمْحًا(2)

تو اس رمح (نیزہ) کو لٹکایا نہیں جاتا، مگر یہ کہ وہ تلوار کی طرح اٹھایا جاتا ہے (لہٰذا اس معنوی مشابہت کی وجہ سے رمحاً سیفاً پر معطوف ہے) اور ابو اسحاق الزجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے: مع شرکائکم علی تناصرکم (پس تم بھی اپنے شریکوں سمیت ایک دوسرے کی مدد کرنے پر جمع ہو جاؤ) جیسے کہا جاتا ہے: التقی الماء والخشبة (پانی لکڑی کے ساتھ مل گیا) اور دوسری قراءت جمع کے بارے ہے، اس میں اس قول باری تعالیٰ کا اعتبار کیا گیا ہے: فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ⓺ (طٰہٰ) (اور اکٹھا کیا اپنی فریب کاریوں کو پھر خود آیا)۔ ابو معاذ نے کہا ہے: اور یہ بھی جائز ہے کہ جمع اور أجمع دونوں ایک ہی معنی میں ہوں، اس قراءت کے مطابق وشرکاءکم، أمرکم پر معطوف ہے یا پھر یہ معنی ہے فأجمعوا أمرکم وأجمعوا شرکاءکم (پس تم متفقہ فیصلہ کرلو اور اپنے شریکوں کو بھی جمع کرلو) اور اگر چاہیں تو بمعنی مع بنالیں (پس تم متفقہ فیصلہ کرلو اپنے شریکوں کے ساتھ مل کر)۔

ابو جعفر نحاس نے کہا ہے: میں نے ابو اسحاق کو سنا ہے وہ قام زید وعمرا کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور تیسری قراءت اس بنا پر ہے کہ شرکاءکم اجمعوا میں ضمیر مرفوع پر عطف کیا جائے۔ اور یہ اچھا ہے، کیونکہ کلام طویل ہو چکی ہے۔ نحاس وغیرہ نے

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 171　　2۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 163

کہا ہے: اور یہ قراءت بہت بعید ہے، کیونکہ اگر یہ مرفوع ہوتا تو پھر واجب تھا کہ اسے واؤ کے ساتھ لکھا جاتا اور مصاحف میں و شرکاءکم میں واؤ نہیں دیکھی گئی اور یہ بھی کہ ان کے شرکاء بت تھے اور بت کچھ نہیں کر سکتے اور ان کا کوئی فعل نہیں یہاں تک کہ انہیں جمع بھی کر لیا جائے۔ مہدوی نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ شرکاء مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہو اور خبر محذوف ہو، یعنی و شرکاءکم لیجمعوا أمرهم (اور تمہارے شرکاء چاہیے کہ وہ اپنے فیصلے پر متفق ہو جائیں) اور اس کی نسبت شرکاء کی طرف کی گئی ہے حالانکہ یہ نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں اور نہ تمیز کر سکتے ہیں، تو یہ ان کی عبادت کرنے والوں کی زجر و توبیخ کے لیے ہے۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً یہ یکن کا اسم اور اس کی خبر ہے۔ اور غمة اور غم دونوں برابر ہیں اور اس کا معنی ہے ڈھانپنا، چھپانا۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: غم الهلال جب چاند چھپ جائے، یعنی چاہیے کہ تمہارا فیصلہ ظاہر ہو اور واضح ہو تم اس میں اس کی قدرت رکھتے ہو جو تم چاہو۔ اس کی طرح نہ ہو جس کا فیصلہ مخفی ہوتا ہے اور وہ اس پر قادر نہیں ہوتا جو وہ ارادہ کرتا ہے۔

طرفہ نے کہا ہے:

لعمرك ما أمرى على بغمة نهارى ولا ليلى على بسرمد

زجاج نے کہا ہے: غمة کا معنی ذاغم ہے اور الغم والغمة کرب اور کربة (غم و پریشانی، تکلیف) کی طرح ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک غمة سے مراد امر کی وہ تنگی ہے جو غم اور پریشانی کو واجب کر دیتی ہے پس جسے یہ لاحق ہو وہ اپنے لیے کوئی ایسا ماخذ اور مصدر نہیں پاتا جس کے سبب وہ اس کیفیت سے نکل جائے جو اسے پریشان اور غمزدہ کر رہی ہے۔ اور صحاح میں ہے کہ الغمة کا معنی الكربة (تکلیف) ہے۔ عجاج نے کہا ہے:

بل لو شهدت الناس إذ تكمّوا بغمة لو لم تفرّج غمّوا(1)

کہا جاتا ہے: أمر غمة یعنی ایسا امر جو مبہم ہو اور اس میں التباس ہو۔ الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ابو عبیدہ نے کہا ہے: اس کا مجازی معنی ظلمة (تاریکی) اور تنگی ہے اور الغمة کا معنی گھی کی مشک کا پیندا بھی ہے۔ اور کسی اور نے کہا ہے: اس میں اصل یہ ہے کہ یہ تمام الغامة سے مشتق ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ، اقْضُوْٓا میں الف ہمزہ وصل ہے، یہ قضى يقضى سے ہے۔ اخفش اور کسائی نے کہا ہے: اور اسی کی مثل یہ ہے: وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ (الحجر: 66) یعنی ہم نے اسے اس تک پہنچا دیا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ نے ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ کے معنی میں فرمایا: پھر تم کر گزرو اور تم مجھے مہلت نہ دو۔ نحاس نے کہا ہے: لغت کے مطابق یہ قول صحیح ہے اور اسی سے قضى الميت یعنی (میت گزر گیا) ہے۔ اور انہیں یہ بتایا کہ وہ آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے اور یہ نبوت کے دلائل میں سے ہے۔

اور فراء نے بعض قراء سے ثُمَّ افْضُوْٓا اِلَيَّ بیان کیا ہے یعنی یہ فا اور ہمزہ قطعی کے ساتھ ہے، یعنی پھر تم میری طرف توجہ

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 132

کرو۔ کہا جاتا ہے: أفضت الخلافة إلى فلان و أفضى إلى الوجع (میں نے فلاں کی طرف خلافت (نیابت) کو متوجہ کیا اور اس نے مجھے درد اور تکلیف پہنچائی) اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے نبی حضرت نوح علیہ السلام کے بارے خبر دی جارہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے ساتھ یقین رکھتے تھے اور ان کی تدبیر اور مکر و فریب سے خوفزدہ نہ ہوئے، کیونکہ انہیں یہ یقین تھا کہ وہ خود اور ان کے معبود نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان اور نہ تکلیف پہنچا سکتے ہیں۔ اور یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور آپ کے دل کے لیے باعث تقویت ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۷۲

"پس ہمہ اگر تم منہ موڑے رہو تو نہیں طلب کیا میں نے تم سے کچھ اجر، نہیں میرا اجر مگر اللہ کے ذمہ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ہو جاؤں مسلمانوں سے"۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ یعنی پس اگر تم نے اس سے اعراض کر لیا ہے جو میں لے کے تمہارے پاس آیا ہوں تو یہ اس لیے نہیں کہ میں نے تم سے کوئی اجر طلب کیا ہے پس میرا معاوضہ اور بدلہ تم پر بھاری اور ثقیل ہو جائے گا۔ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے سلسلہ میں میرا اجر تو فقط اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک ماننے والوں میں سے ہو جاؤں۔ اہل مدینہ ابو عمرو، ابن عامر اور حفص نے أجري میں یاء کو فتحہ دیا ہے جہاں بھی واقع ہوا اور باقیوں نے اسے ساکن پڑھا ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَ جَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَ اَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝۷۳

"تو آپ کی قوم نے آپ کو جھٹلایا پس ہم نے نجات دی انہیں اور جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے اور ہم نے بنا دیا انہیں ان کا جانشین اور ہم نے غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ذرا دیکھو کیسا انجام ہوا ان کا جنہیں ڈرایا گیا تھا"۔

قولہ تعالیٰ: فَكَذَّبُوْهُ یعنی حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی قوم نے جھٹلایا۔ فَنَجَّيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ پس ہم نے آپ کو اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والوں کو نجات دی۔ فِي الْفُلْكِ یعنی جو کشتی میں آپ کے ساتھ سوار تھے۔ اس کا ذکر عنقریب آئے گا۔ وَ جَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ اور ہم نے انہیں زمین کی باسی اور غرق ہونے والوں کا جانشین بنا دیا۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ یعنی ذرا دیکھو ان کے معاملے کا انجام کیسا ہوا جنہیں رسولوں نے ڈرایا اور وہ ایمان نہ لائے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۷۴

''پھر ہم نے بھیجے نوح (علیہ السلام) کے بعد اور رسول ان کی قوموں کی طرف پس وہ لائے ان کے پاس روشن دلیلیں تو وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے اس پر جسے وہ جھٹلا چکے تھے پہلے یونہی ہم مہر لگا دیتے ہیں سرکشوں کے دلوں پر''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ یعنی پھر ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کے بعد بھیجے۔ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ رسول جیسے حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ۔ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ پس وہ ان کے پاس معجزات لے کر آئے۔ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ تقدیر کلام ہے: تو وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے اس پر جسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم اس سے پہلے جھٹلا چکی تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ یعنی جسے وہ پہلے یوم الذر (یوم میثاق) کو جھٹلا چکے تھے، کیونکہ ان میں وہ تھے جنہوں نے اپنے دل سے جھٹلایا تھا اگرچہ تمام نے بلیٰ (ہاں) کہا تھا۔ نحاس نے کہا ہے: اس بارے میں جو سب سے اچھا قول کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ اس قوم کے سرداروں کے بارے ہے، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (البقرہ) (چاہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے) كَذٰلِكَ نَطْبَعُ یونہی ہم مہر لگا دیتے ہیں۔ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ کفر اور تکذیب میں حد سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر، پس وہ ایمان نہیں لا سکتے۔ اور یہ آیت قدریہ کے قول کا رد کرتی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡىِٕهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝

''پھر ہم نے بھیجا ان رسولوں کے بعد موسیٰ اور ہارون (علیہم السلام) کو فرعون اور ان کے درباریوں کی طرف اپنی نشانیوں کے ساتھ تو فرعونیوں نے غرور و تکبر کیا اور وہ مجرم لوگ تھے''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ پھر ہم نے ان رسولوں اور امتوں کے بعد بھیجا۔ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡىِٕهٖ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو فرعون اور اس کی قوم کے اشراف کی طرف۔ بِاٰيٰتِنَا یہاں مراد آیات تسع (نو معجزات) ہیں، ان کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ فَاسْتَكْبَرُوْا تو انہوں نے حق (قبول کرنے سے) غرور و تکبر کیا۔ وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ اور وہ مشرک لوگ ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ قَالَ مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ۝

''پھر جب آیا ان کے پاس حق ہماری طرف سے تو انہوں نے کہہ دیا کہ یقیناً یہ کھلا جادو ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا (عقل کے اندھو) کیا تم کہتے ہو (ایسی بات) حق کے متعلق جب وہ تمہارے پاس آیا (سوچو!) کیا یہ جادو ہے؟ اور نہیں کامیاب ہوتے جادوگر''۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا اس سے مراد فرعون اور اس کی قوم ہے (یعنی جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا) قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ تو انہوں نے معجزات کو سحر (جادو) پر محمول کیا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو کہا: اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا۔ کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے، اس کا معنی ہے: کیا تم حق کے متعلق کہتے ہو یہ سحر ہے، پس اتقولون یہ انکار ہے اور ان کا قول هٰذَا لَسِحْرٌ (یہ جادو ہے) محذوف ہے، پھر موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے از سر نو دوسرا انکار ہوا اور فرمایا: اَسِحْرٌ هٰذَا (کیا یہ جادو ہے) پس ان کا پہلا قول ان کے دوسرے قول پر اکتفاء کرتے ہوئے حذف کر دیا گیا، درآنحالیکہ اس میں فرعون اور اس کے درباریوں کا انکار کیا گیا ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے: یہ ان کے قول میں سے ہے اور ان کے قول کی حکایت کے لیے اس پر الف استفہام داخل کر دیا گیا ہے، کیونکہ انہوں نے کہا: اَسِحْرٌ هٰذَا تو انہیں کہا گیا: کیا تم حق کے متعلق کہتے ہو جب وہ تمہارے پاس آیا: کیا یہ جادو ہے؟ اور یہ حسن سے مروی ہے۔

وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ یعنی وہ کامیاب نہیں ہوتے جو اس کے ساتھ آئے (یعنی جادو لے کر آئے)

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۷۸

''کہنے لگے کیا تم اس لیے آئے ہو ہمارے پاس تاکہ ہٹا دو ہمیں اس (دین) سے جس پر ہم نے پایا اپنے باپ دادا کو اور ہو جائے صرف تم دونوں کے لیے بڑائی سرزمین (مصر) میں اور ہم لوگ تو تم کو نہیں مانیں گے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا کہنے لگے: کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو تاکہ ہمیں پھیر دو اور موڑ دو۔ کہا جاتا ہے: لفتہ یلفتہ لفتا جب وہ اسے موڑ دے اور پھیر دے۔

جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

تلفّتُ نحو الحیّ حتی رأیتُنی — وجِعْتُ من الاصغاء لیتًا واخدَعا

اور اسی سے التفت (میں مڑ گیا) ہے بے شک اس کا معنی سامنے کی جہت سے پھر جانا اور مڑ جانا ہے۔ عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا مراد بتوں کی عبادت سے ہٹا دینا ہے۔ وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ اور صرف تم دونوں کے لیے عظمت، بادشاہی اور سلطنت ہو جائے۔ فِي الْاَرْضِ مراد سرزمین مصر ہے۔ اور بادشاہی (ملک) کے لیے الکبریاء کہا جا رہا ہے کیونکہ یہ سب سے بڑی (شے) ہے جس کی طلب دنیا میں کی جاتی ہے۔ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ (اور ہم لوگ تو تم کو نہیں مانیں گے)۔ حضرت ابن مسعود اور حسن رضی اللہ عنہما وغیرہ نے ویکون یا کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ مونث غیر حقیقی ہے اور ان دونوں کے درمیان فرق بیان کیا گیا ہے۔ اور سیبویہ نے بیان کیا ہے: حضر القاضی الیوم امراتان (آج قاضی کے پاس دو عورتیں حاضر ہوئیں)

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝۷۹

''اور فرعون نے حکم دیا (فوراً) لے آؤ میرے پاس ہر ماہر جادوگر''۔

اس نے یہ تب کہا جب اس نے عصا مبارک اور ید بیضا دیکھا اور یہ اعتقاد بنایا کہ یہ دونوں چیزیں جادو ہیں۔ حمزہ، کسائی، ابن وثاب اور اعمش نے سحار پڑھا ہے اور سورۃ الاعراف میں ان دونوں کی بحث گزر چکی ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝

''پھر جب آگئے جادوگر تو کہا انہیں موسیٰ (علیہ السلام) نے ڈالو (میدان میں) جو تم ڈالنے والے ہو''۔

یعنی انہیں زمین پر پھینکو جو تمہارے پاس رسیاں اور لاٹھیاں ہیں۔ اس کے بارے میں مکمل بحث سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے۔

فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

''پھر جب ڈال دیا انہوں نے تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یہ جو تم لائے ہو یہ جادو ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ ملیا میٹ کردے گا اسے، بے شک اللہ تعالیٰ نہیں سنوارتا شریروں کے کام کو''۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ اس میں ما مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہوگا اور اس کی خبر جِئْتُمْ بِهِ ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے: أی شئ جئتم به (جو شے بھی تم لے کر آئے ہو) یہ ایک توزجر و توبیخ کے لیے ہے اور دوسرا جو جادو لے کر آئے اس کی حقارت بیان کرنے کے لیے ہے۔ اور ابو عمرو کی قراءت السحر استفہام کی طرز پر ہے اس صورت میں مبتدا مضمر ہوگا اور تقدیر عبارت ہوگی أهو السحر (کیا وہ جادو ہے)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا ہو اور خبر محذوف ہو اور تقدیر عبارت ہو: السحر جئتم به۔ اور جنہوں نے استفہام کی صورت میں قراءت کی ہے ان کے مطابق ما بمعنی الذی نہیں ہوگا، کیونکہ اس کی کوئی خبر نہیں۔ اور باقیوں نے خبر ہونے کی بناء پر السحر پڑھا ہے۔ اور اس قراءت کی دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی قراءت ہے: ما جئتم به سحر اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت: ما آتیتم به سحر (جو تم لائے ہو جادو ہے) پس ما بمعنی الذی ہے اور جئتم به صلہ ہے اور مبتدا ہونے کی وجہ سے ما محل رفع میں ہے۔ اور السحر مبتدا کی خبر ہے اور ما کو جب بمعنی الذی بنائیں گے تو پھر وہ منصوب نہیں ہوگا کیونکہ صلہ موصول میں عمل نہیں کرسکتا۔ اور فراء نے السحر کو جئتم کے سبب نصب دینے کو جائز قرار دیا ہے اور ما شرط کے لیے ہو، اور جئتم محل جزم میں ہو اور فاء محذوف ہو۔ اور تقدیر ہوگی: فان الله سیبطله (تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے باطل (ختم) کردے گا) اور یہ بھی جائز ہے کہ السحر کو مصدر ہونے کی بنا پر نصب دی جائے۔ ای ما جئتم به سحرا، پھر اس پر الف لام زائدہ داخل کردیا گیا ہو، پس اس تقدیر پر حذف فا کی حاجت اور ضرورت نہیں ہوگی اور نحاس نے اس قول کو پسند کیا ہے اور کہا ہے: مجازات میں فاء کے حذف کو اکثر نحوی جائز قرار نہیں دیتے مگر ضرورت شعر کے لیے، جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

من یفعل الحسنات الله یشکرها

''جو نیکیاں کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان کی قدر کرتا ہے''۔

بلکہ بسا اوقات بعض نے کہا ہے: یہ قطعاً جائز نہیں ہے۔ اور میں نے علی بن سلیمان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے، مجھے محمد بن یزید نے بیان کیا اس نے کہا مجھے مازنی نے بیان کیا، اس نے کہا میں نے اصمعی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: نحویوں نے اس شعر کو بدل دیا ہے اور روایت یہ ہے: من یفعل الخیر فالرحمن یشکرہ۔ اور میں نے علی بن سلیمان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: مجازاۃ میں فا کا حذف جائز ہے، انہوں نے کہا ہے: اس پر دلیل یہ ارشاد گرامی ہے: وَمَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ (الشوریٰ:30)

وما اصابکم من مصیبۃ بما کسبت ایدیکم اس میں یہ دونوں قراءتیں (فا کے ساتھ اور فا کے بغیر) مشہور و معروف ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ مراد سحر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جو کوئی رات کے وقت اپنے بستر پر گیا پھر یہ آیت پڑھی: مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَیُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ کسی جادوگر کی تدبیر اور مکر اسے نقصان نہیں دے گا اور اگر کسی سحر زدہ کو یہ لکھ کر دی گئی تو اللہ تعالیٰ اس سے سحر دور فرما دے گا۔

وَ یُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸۲

"اور اللہ تعالیٰ حق کو حق کر دکھاتا ہے اپنے ارشادات سے اور خواہ ناپسند ہی کریں (اسے) مجرم"۔

قولہ تعالیٰ: وَ یُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ یعنی اللہ تعالیٰ حق کو بیان کرتا ہے اور اس کی وضاحت کرتا ہے۔ بِكَلِمٰتِهٖ یعنی اپنے کلام، حجج اور اپنے دلائل کے ساتھ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اپنی مدد و نصرت عطا کر کے (حق کو حق کر دکھاتا ہے) وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ آل فرعون کے مجرم اسے ناپسند ہی کریں۔

فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّیَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡىِٕهِمْ اَنْ یَّفْتِنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ ۚ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَ ۝۸۳

"پس نہ ایمان لائے موسیٰ پر بجز ان کی قوم کی اولاد کے (وہ بھی) ڈرتے ہوئے فرعون سے اور اپنے سرداروں سے کہ کہیں وہ انہیں بہکا نہ دے۔ اور واقعی فرعون بڑا سرکش (بادشاہ) تھا ملک میں اور واقعی وہ حد سے بڑھنے والوں میں سے تھا"۔

قولہ تعالیٰ: فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّیَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ اس میں ہا ضمیر موسیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی ان میں سے کوئی ایمان نہ لایا، بلاشبہ بنی اسرائیل میں سے ان کی اولاد ایمان لائی جن کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا، طویل وقت گزر گیا آباؤ اجداد ہلاک ہو گئے اور بیٹے باقی رہے پس وہ ایمان لائے (1)۔ اور یہ علامہ طبری کی پسند ہے اور ذریت سے مراد انسان کی پیچھے آنے والی نسل ہے اور کبھی یہ کثیر ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذریت سے بنی اسرائیل کے مومن مراد لیے ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ چھ لاکھ تھے۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام مصر میں بہتر افراد کے ساتھ داخل ہوئے پھر وہ مصر میں بچوں کی ولادت کے سبب بڑھتے رہے یہاں تک کہ چھ لاکھ

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 172، (مفہوم)

تک پہنچ گئے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی فرمایا: مِّنْ قَوْمِهٖ یعنی فرعون کی قوم سے۔ ان میں سے آل فرعون کے مومن اور فرعون کا خازن اور اس کی بیوی اور فرعون کی بیٹی کی ماشطہ (اسے بناؤ سنگار کرنے والی) اور اس کے خازن کی بیوی (یہ مومن تھے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ اقوام ہیں جن کے آباء قبطی تھے اور ان کی مائیں بنی اسرائیل میں سے تھیں پس انہیں ذریت کا نام دیا گیا جیسا کہ ان گھوڑوں کی اولاد کو ابناء کا نام دیا جاتا ہے جو یمن اور بلاد عرب سے پیدا ہوتے ہیں، کیونکہ ان کی مائیں ان کے باپوں کی جنس سے نہیں۔ یہ فراء نے کہا ہے۔ اور اس بنا پر قومه میں ہا ضمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ انہیں ماؤں کی جہت سے قرابت حاصل ہے اور فرعون کی طرف لوٹتی ہے جب وہ (آباء) قبطی ہوں۔

قولہ تعالیٰ: عَلٰی خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ کیونکہ وہ سرکشی کرتے ہوئے ان پر مسلط ہے (اس لیے وہ فرعون سے ڈرتے ہیں) وَ مَلَاۡىِٕهِمْ (اور اپنے سرداروں سے) یہاں وملئہ نہیں کہا۔ اس کے چھ جواب دیئے گئے ہیں: (۱) کہ فرعون جب جابر و ظالم تھا تو اس کی طرف سے تمام کے فعل کی خبر دی گئی (۲) کہ فرعون کا جب ذکر کیا گیا تو اس سے معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ اور بھی ہیں پس ضمیر اس (فرعون) کی طرف اور دوسرے تمام کی طرف لوٹائی۔ یہ فراء کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ (۳) کہ فرعون کو ثمود کی طرف جماعت کا نام دیا گیا ہے (اس لیے ضمیر جمع لوٹائی گئی) (۴) تقدیر عبارت یہ ہو: علی خوف من آل فرعون پس یہ مضاف کے حذف کے باب سے ہوگا جیسا کہ واسئل القریۃ میں ہے اور یہ فراء کا دوسرا قول ہے۔ اور یہ جواب سیبویہ اور خلیل کے مذہب کے مطابق غلط ہے۔ ان دونوں کے نزدیک یہ جائز نہیں قامت هند کہہ کر تیری مراد اس کا غلام ہو۔ (۵) اخفش سعید کا مذہب یہ ہے کہ ضمیر ذریۃ کی طرف لوٹ رہی ہے مراد ذریۃ (اولاد) کے سردار ہیں اور یہی علامہ طبری کی پسند ہے (۶) کہ ضمیر فرعون کی قوم کی طرف لوٹ رہی ہو۔ نحاس نے کہا ہے: یہ جواب گویا زیادہ بلیغ ہے۔ اَنْ یَّفْتِنَهُمْ فرعون کے بارے خبر دینے کی بنا پر یفتنهم کو واحد ذکر کیا ہے کہ وہ انہیں سزاؤں کے سبب اپنے دین سے پھیر دے اور یہ محل جر میں ہے اس بنا پر کہ یہ بدل اشتمال ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ خوف کے سبب نصب کے محل میں ہو اور فرعون غیر منصرف ہے کیونکہ یہ عجمی اسم ہے اور یہ معرفہ ہے۔ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ یعنی فرعون سرکشی کرنے والا متکبر ہے۔ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَ اور بے شک وہ کفر میں حد سے بڑھنے والوں میں سے ہے، کیونکہ وہ بندہ ہے اور اس نے دعویٰ ربوبیت کا کیا ہے۔

وَ قَالَ مُوْسٰی یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَیْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ۝۸۴ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۝۸۵

”اور موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اے میری قوم! اگر تم ایمان لائے ہو اللہ تعالیٰ پر تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم سچے مسلمان ہو۔ انہوں نے عرض کی اللہ تعالیٰ پر ہی ہم نے بھروسہ کیا ہے۔ اے ہمارے رب! نہ بنا ہمیں فتنہ (کا موجب) ظالم قوم کے لیے“۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ مُوْسٰی یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ یعنی اگر تم نے تصدیق کی ہے۔ بِاللّٰهِ فَعَلَیْهِ تَوَكَّلُوْۤا اللہ تعالیٰ کی تو اسی پر اعتماد کرو۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ شرط بطور تاکید مکرر ذکر کی گئی ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ کمال ایمان امر کو اللہ تعالیٰ کے حوالے

اور سپرد کرنے کے ساتھ ہوتا ہے۔ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا انہوں نے عرض کی ہم نے اپنے امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیئے۔ اور ہم اس کی قضاء وقدر کے ساتھ راضی ہیں اور ہماری انتہا اس کے امر تک ہے۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ یعنی تو ہمارے خلاف ان کی مدد نہ کر، پس وہ ہمارے لیے دین کے بارے فتنہ ہو جائے گا یا تو ہمیں نہ مٹا دے کہ تو ہمیں ان کے سامنے عذاب دے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تو ہمیں ہمارے دشمنوں کے سامنے ہلاک نہ کر اور ہمیں اپنی طرف سے کوئی عذاب نہ دے، پس ہمارے دشمن کہیں گے: اگر وہ حق پر ہوتے تو ہم ان پر مسلط نہ کیے جاتے پس کہ وہ آزمائے جائیں (1)۔ ابومجلز اور ابوالضحاء نے کہا ہے: مراد یہ ہے تو انہیں ہم پر غلبہ نہ دے کہ وہ یہ خیال کرنے لگیں کہ وہ ہم سے بہتر ہیں، پس ان کی سرکشی بڑھ جائے گی۔

وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

"اور نجات دے ہمیں اپنی رحمت سے کافروں (کے ظلم وستم) سے"۔

قولہ تعالیٰ: وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ یعنی ہمیں خلاصی عطا فرما اپنی رحمت کے ساتھ۔ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ یعنی فرعون اور اس کی قوم سے، کیونکہ وہ انہیں مشقت آمیز اور تکلیف دہ کاموں کے ساتھ پکڑ لیتے تھے۔

وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

"اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف کہ مہیا کرو اپنی قوم کے لیے مصر میں چند گھر اور بناؤ اپنے گھروں کو قبلہ رخ اور قائم کرو نماز۔ اور (اے موسیٰ!) خوشخبری دو مومنوں کو"۔

قولہ تعالیٰ وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ تم بناؤ۔ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا کہا جاتا ہے: بوأت زيد امكانا اور بوأت لزيد مكانا (میں نے زید کے لیے مکان بنایا) اور المبواوہ گھر اور منزل ہے جسے لازم پکڑا گیا ہو۔ اور اسی سے ہے بواہ الله منزلا یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے لیے لازم کر دیا ہے اور اسے سکونت عطا کر دی۔ اور اسی معنی میں یہ حدیث طیبہ بھی ہے: "جس نے جان بوجھ کر میرے بارے میں جھوٹ بولا تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے" (2)۔ اور راجز کا قول ہے:

نحن بنو عدنان ليس شك تبوأ المجد بنا والملك(3)

ہم بنو عدنان ہیں اس میں کوئی شک نہیں بزرگی اور بادشاہی ہمارے ساتھ لازم ہے۔

اس آیت میں مصر سے مراد اسکندریہ شہر ہے۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: بے شک یہ ایک

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 175
2۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 90
3۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 446

شہر ہے جس کا نام مصر ہے اور مصر بحر (سمندر) سے اسوان کی طرف جاتے ہوئے درمیان میں واقع ہے اور اسکندریہ سرزمین مصر میں سے ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل صرف اپنی مساجد اور گرجا گھروں میں نماز پڑھتے تھے اور وہ ظاہر تھے، پس جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی طرف بھیجا گیا تو فرعون نے بنی اسرائیل کی مساجد کے بارے میں حکم دیا اور تمام کی تمام گرادی گئیں اور انہیں نماز سے روک دیا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی طرف وحی فرمائی کہ وہ دونوں بنی اسرائیل کے لیے مصر میں چند گھر بنائیں اور پسند کریں، مراد مساجد ہیں، اللہ تعالیٰ نے رہائشی گھر مراد نہیں لیے۔ یہ قول ابراہیم، ابن زید، ربیع، ابی مالک اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ اس کا معنی ہے: تم اپنے گھر بناؤ جو بعض بعض کے بالمقابل ہوں، آمنے سامنے ہوں۔ پہلا قول اصح ہے، یعنی تم قبلہ رخ اپنی مساجد بناؤ۔ کہا گیا ہے کہ یہ بیت المقدس ہے اور وہی آج تک یہودیوں کا قبلہ ہے۔ یہ ابن بحر نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد کعبہ معظمہ ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ کعبہ معظمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام(1) اور ان کے ساتھیوں کا قبلہ تھا اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ نماز میں قبلہ (رخ ہونا) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت تھی۔ (لہٰذا) نماز میں طہارت، ستر عورت اور قبلہ سمت منہ کرنے کی شرط لگانے سے اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، کیونکہ یہ تکلیف اور پابندی تک زیادہ پہنچانے والی ہیں اور عبادت کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہے تم اپنے گھروں میں چھپ کر نماز پڑھو تا کہ تم امن میں رہو۔ اور یہ اس وقت ہوا جب فرعون نے انہیں خوفزدہ کیا تو انہیں صبر اختیار کرنے اور گھروں میں مساجد بنانے کا حکم دیا گیا اور نماز اور دعا کا اقدام کرنے کا حکم دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرما دے۔

اور اللہ تعالیٰ کے اس قول سے یہی مراد ہے: قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا الآیہ (الاعراف: 128) (فرمایا موسیٰ نے اپنی قوم کو (اس آزمائش میں) مدد طلب کرو اللہ سے اور صبر و استقامت سے کام لو) اور ان کے دین میں سے یہ تھا کہ وہ فقط عبادت گاہوں اور گرجا گھروں میں نماز پڑھتے تھے جب تک وہ امن و سلامتی میں رہے اور جب انہیں خوف لاحق ہوا تو انہیں اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنے گھروں میں نماز پڑھ لیں۔ ابن عربی نے کہا ہے: دونوں قولوں میں سے پہلا زیادہ ظاہر اور واضح ہے کیونکہ دوسرا تو دعویٰ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: قولہ دعوی یہ صحیح ہے، کیونکہ صحیح میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”میرے لیے زمین کو مسجد اور طہارت کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے“۔ اور یہ ان میں سے ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے نہ کہ دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ، پس ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کے ساتھ مساجد اور گھروں میں نماز پڑھتے ہیں اور ہر اس جگہ جہاں نماز (کا وقت) ہمیں پالے، مگر گھروں میں نفل نماز ادا کرنا مساجد میں پڑھنے کی نسبت افضل ہے، یہاں تک کہ جمعہ سے پہلے اور بعد کی

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 176

رکعتیں بھی۔ اور فرض نمازوں سے پہلے اور بعد میں (بھی دیگر نماز گھر میں پڑھنا افضل ہے) کیونکہ نوافل میں ریا کا امکان ہوتا ہے اور فرائض میں اس کا امکان نہیں ہوتا۔ اور جب بھی کوئی عمل ریا سے خالص اور پاک ہو تو وہ زیادہ وزنی اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے زیادہ قریب کرنے والا ہوتا ہے۔

مسلم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن شقیق سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا، میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی نفل نماز کے بارے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: آپ ﷺ میرے حجرہ میں ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھتے تھے، پھر آپ مسجد میں تشریف لے جاتے اور لوگوں کو نماز پڑھاتے پھر آپ (حجرہ میں) تشریف لاتے اور دو رکعت نماز ادا فرماتے اور آپ ﷺ لوگوں کے ساتھ مغرب کی نماز ادا فرماتے تھے، پھر آپ (حجرہ میں) تشریف لاتے اور دو رکعتیں پڑھتے تھے، پھر آپ لوگوں کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھتے تھے اور میرے حجرہ میں تشریف لاتے اور دو رکعتیں نماز پڑھتے تھے۔۔۔۔ الحدیث''۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: میں نے حضور نبی مکرم ﷺ کی معیت میں ظہر سے پہلے دو رکعتیں اور اس کے بعد دو رکعتیں اور مغرب کی نماز کے بعد دو رکعتیں پڑھی ہیں، پس جہاں تک مغرب، عشاء اور جمعہ کا تعلق ہے تو میں نے حضور نبی مکرم ﷺ کے ساتھ آپ کے کاشانہ اقدس میں نماز پڑھی ہے۔ اور ابوداؤد نے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ بنی اشہل کی مسجد میں تشریف لائے اور اس میں مغرب کی نماز پڑھائی۔ پس جب وہ اپنی نماز پوری کر چکے تو آپ نے انہیں اس کے بعد نفل پڑھتے ہوئے دیکھا تو آپ نے فرمایا: ''یہ گھروں میں پڑھی جانے والی نماز ہے''۔ (1)

مسئلہ نمبر 3۔ اس باب میں قیام رمضان کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے، کیا گھر میں رمضان کی تراویح ادا کرنا افضل ہے یا مسجد میں؟ تو اس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے اس کے لیے گھر میں قیام کرنا افضل ہے جو اس کی قوت اور طاقت رکھتا ہو اور یہی امام ابو یوسف اور بعض اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ اور ابن عبدالحکم، امام احمد اور بعض اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہم اس طرف گئے ہیں کہ انہیں جماعت کی صورت میں پڑھنا افضل ہے۔ اور لیث نے کہا ہے: اگر لوگ اپنے گھروں میں قیام کریں اور کوئی بھی مسجد میں قیام نہ کرے تو بھی نہیں چاہیے کہ وہ اس (مسجد) کی طرف نکلیں۔ امام مالک اور جس نے یہ قول کیا ہے ان کی دلیل آپ ﷺ کا وہ ارشاد ہے جو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ''پس تم پر اپنے گھروں میں نماز پڑھنا لازم ہے، کیونکہ فرض نماز کے سوا آدمی کی بہترین نماز اس کے گھر میں ہے''۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

مخالف کا استدلال یہ ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے مسجد میں جماعت کے ساتھ یہ نماز پڑھائی، پھر اس مانع کے بارے بھی بتایا جس نے آپ کو اس پر دوام اختیار کرنے سے روک دیا اور وہ ان پر فرض ہونے کا خوف اور اندیشہ تھا پس اسی لیے

1۔ سنن ابی داؤد، باب رکعتی المغرب این تصلیان، حدیث نمبر 1106، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
جامع ترمذی، باب ما ذکر فی الصلاۃ بعد المغرب، حدیث نمبر 549، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: فعلیکم بالصلوٰۃ فی بیوتکم (پس تم پر اپنے گھروں میں نماز پڑھنا لازم ہے) پھر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مسجد میں متفرق گروہوں کی صورت میں نماز پڑھتے رہے یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں ایک قاری پر جمع کر دیا اور اسی پر یہ امر پختہ ہو گیا اور سنت ثابت ہو گئی۔

مسئلہ نمبر 4۔ اور جب ہم اس پر آچکے ہیں کہ ان کے لیے اپنے گھروں میں نماز پڑھنا مباح ہے جب کہ انہیں اپنے آپ پر خوف اور خطرہ ہو تو پھر اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ معذور آدمی کے لیے خوف کے ساتھ اور خوف کے بغیر دونوں حالتوں میں جماعت اور جمعہ ترک کرنا جائز ہے۔ اور وہ عذر جو اس کو مباح قرار دیتا ہے (وہ یہ ہے) مثلاً وہ بیماری جو روکنے والی ہو یا خوف کا زیادہ ہونا یا مال یا بدن میں بغیر کسی حق کے فیصلے کے حاکم وقت کے ظلم کا خوف ہونا اور موسلا دھار بارش کیچڑ کے ساتھ یہ بھی عذر ہے اگر وہ نہ رکے اور وہ آدمی جس کے لیے وہ قریبی ولی ہے وہ قریب المرگ ہو جائے اور اس کے پاس اس کی تیمارداری اور دیکھ بھال کرنے والا اور کوئی نہ ہو (تو یہ بھی ایک عذر ہے) تحقیق حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایسا کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ کہا گیا ہے: یہ خطاب حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ خطاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہے۔ اور یہ زیادہ واضح اور بین ہے، یعنی بنی اسرائیل کو بشارت دے دو کہ عنقریب اللہ تعالیٰ انہیں اپنے دشمن پر غالب کر دے گا۔

وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۸۸

''اور عرض کی موسیٰ نے اے ہمارے پروردگار! تو نے بخشا ہے فرعون اور اس کے سرداروں کو سامان آرائش اور مال و دولت دنیوی زندگی میں اے ہمارے مولا! کیا اس لیے کہ وہ گمراہ کرتے پھریں (لوگوں کو) تیری راہ سے۔ اے ہمارے رب! برباد کر دے ان کے مالوں کو اور سخت کر دے ان کے دلوں کو تا کہ وہ نہ ایمان لے آئیں جب تک نہ دیکھ لیں دردناک عذاب کو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ اس میں اٰتَيْتَ بمعنی اعطیت (تو نے عطا کیا ہے) زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی مال دنیا، ان کے لیے فسطاط مصر سے لے کر سرزمین حبشہ تک ایسے پہاڑ تھے جن میں سونے، چاندی، زبرجد، زمرد اور یاقوت کی کانیں تھیں۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ اس لام کے بارے میں اختلاف ہے۔ اور اس بارے میں جو کہا گیا ہے اصح وہ ہے جو خلیل اور سیبویہ کا قول ہے وہ یہ کہ لام برائے عاقبت اور صیرورت ہے۔ اور حدیث میں ہے'' بے شک اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ ہے جو ہر روز ندا دیتا ہے جنو موت کے لیے اور بناؤ ویران اور خراب ہونے کے لیے'' یعنی جب ان کے معاملہ کا انجام گمراہی ہے تو وہ اس طرح ہو گیا گویا اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کیا کہ وہ گمراہ ہو جائیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام کی ہے یعنی میں نے انہیں (مال) دیا تا کہ وہ گمراہ ہوں اور رعونت وتکبر اختیار کریں (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام اجل ہے یعنی میں نے انہیں عطا کیا ان کے آپ سے اعراض کرنے کی وجہ سے کہ وہ خوفزدہ نہ ہوں کہ ان سے اعراض کر لیا گیا ہے۔ اور ایک قوم نے گمان کیا ہے کہ اس کا معنی ہے: میں نے انہیں یہ اس لیے دیا ہے تا کہ وہ گمراہ نہ ہوں۔ پھر لا کو کلام سے حذف کر دیا گیا ہے (اعطیتم ذالك لئلا یضلوا، فحذفت لا) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا (النساء: 176) اس کا معنی ہے لان لا تضلوا (تا کہ تم گمراہ نہ ہو)

نحاس نے کہا ہے: ظاہراً یہ جواب اچھا ہے، مگر عرب ان کے بغیر صرف لا کو حذف نہیں کرتے۔ اور اس جواب والے نے قول باری تعالیٰ: اَنْ تَضِلُّوْا کے بارے میں محض بناوٹ کی ہے (یعنی جھوٹ بولا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام دعا کے لیے ہے، یعنی تو انہیں اپنے راستے سے گمراہ کر کے آزما، کیونکہ اس کے بعد یہ ارشاد ہے: اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ (برباد کر دے ان کے مالوں کو اور سخت کر دے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ فعل مصدر کے معنی میں ہے یعنی اضلالهم جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ (توبہ: 95) (یعنی یہ بمعنی اعراضهم ہے) اور کوفیوں نے لیضلوا یاء کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ اضلال سے ہے اور باقیوں نے اسے فتحہ دیا ہے۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ یعنی انہیں ان کے کفر پر ان کے مالوں کو ہلاک و برباد کر کے سزا دے۔ زجاج نے کہا ہے: طمس الشیء کا معنی ہے کسی چیز کو اپنی اصل صورت سے ختم کر دینا (شکل بگاڑ دینا)۔ حضرت ابن عباس اور حضرت محمد بن کعب رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے: ان کے اموال اور ان کے دراہم منقش پتھر بن گئے جیسا کہ ان کی ہیئت تھی مکمل، تہائی اور نصف۔ اور ان کی کوئی معدن باقی نہ رہی مگر اللہ تعالیٰ نے اسے مٹا دیا اور اس کے بعد کوئی اس سے فائدہ حاصل نہ کر سکا۔ اور حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: ہم تک یہ خبر پہنچی ہے کہ ان کے اموال اور ان کی کھیتیاں پتھر ہو گئیں۔ اور حضرت مجاہد اور حضرت عطیہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک و برباد کر دیا یہاں تک کہ وہ دکھائی نہ دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے: عین مطموسة (ایسی آنکھ جس کی بینائی جاتی رہے) اور طمس الموضع جب کسی جگہ کو مٹا دیا جائے بالکل ختم کر دیا جائے۔ اور ابن زید نے کہا ہے: ان کے دنانیر و دراہم، ان کے قالین اور ان کی ہر شی پتھر ہو گئی۔ محمد بن کعب نے کہا ہے: ان میں سے ایک آدمی اپنی اہلیہ کے ساتھ اپنے بستر میں تھا اور وہ دونوں پتھر ہو گئے۔ بیان کیا: حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اس کے بارے آپ کو ذکر کیا تو آپ نے ایک تھیلا منگایا جو مصر سے لایا گیا تھا تو آپ نے اس سے پھل، دراہم اور دنانیر نکالے اس حال میں کہ وہ سب پتھر تھے اور علامہ سدی نے کہا ہے یہ نو معجزات میں سے ایک تھا۔ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی تو انہیں ایمان لانے سے روک دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو انہیں (ان کے دلوں کو) سخت کر دے اور ان پر مہر لگا دے تا کہ وہ ایمان کے لیے کھل نہ سکیں۔ اس کا معنی ومفہوم ایک ہی ہے۔ فَلَا یُؤْمِنُوْا کہا گیا ہے: اس کا عطف لِیُضِلُّوْا پر ہے۔ ای آتیتهم النعم لیضلوا ولا یومنوا (یعنی میں نے انہیں سامان دنیا عطا فرمایا تا کہ وہ گمراہ ہو جائیں اور ایمان نہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 262

لائیں) یہ زجاج اور مبرد نے کہا ہے: اس بنا پر اس میں دعا کے معنی میں سے کوئی شے نہ ہو گی۔ اور قولہ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ کلام معترض ہوگا اور فراء اور کسائی اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: یہ دعا ہے، پس وہ ان کے نزدیک جزم کے محل میں ہے۔ ای اللھم فلا یؤمنوا (اے اللہ! پس چاہیے کہ وہ ایمان نہ لائیں) یعنی پس وہ ایمان نہ لائے۔ اور اس سے اعشیٰ کا قول ہے:

فلا ینبسطْ من بین عینَیْك ما انزَوی ولا تَلْقَنی الا وأنفُسك راغِمُ

یعنی لا أنبسط ہے اور جنہوں نے کہا ہے کہ لِيُضِلُّوا دعا ہے یعنی تو انہیں گمراہی میں مبتلا کر دے۔ انہوں نے کہا ہے: اس پر فلا یؤمنوا کا عطف کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ جواب امر ہے ای واشدد علی قلوبھم فلا یؤمنوا (تو ان کے دلوں کو سخت کر دے تاکہ وہ ایمان نہ لائیں) یہ قول اخفش اور فراء کا بھی ہے۔ اور فراء نے یہ شعر بھی کہا ہے:

یا ناق سیری عَنَقًا فسیحا الی سلیمان فنستریحا

پس اسی بنا پر فلا یؤمنوا میں نون کو حذف کر دیا گیا ہے، کیونکہ وہ منصوب ہے۔ حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہی فرق ہے۔ تحقیق بعض لوگوں نے اس آیت میں اشکال ظاہر کیا ہے اور کہا ہے: یہ ان کے لیے بددعا کیسے ہو سکتی ہے حالانکہ رسل علیہم السلام کو تو حکم اپنی قوم کے ایمان لانے کی دعا کرنے کا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ جائز نہیں کہ کوئی نبی علیہ السلام اپنی قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر بددعا کرے اور اس اطلاع کے بغیر کہ ان میں کوئی ایسا نہیں جو ایمان لائے گا اور نہ ان کی پشتوں سے کوئی ایسا نکلے گا جو ایمان لائے گا، اس کی دلیل حضرت نوح علیہ السلام (کی طرف وحی کیا گیا اللہ تعالیٰ) کا یہ قول ہے: اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ (ہود: 36) (کہ نہیں ایمان لائیں گے آپ کی قوم سے بجز ان کے جو ایمان لا چکے) اور اس وقت آپ نے یہ دعا مانگی: رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا ﴿۲۶﴾، الآیہ (نوح) واللہ اعلم (اے میرے رب نہ چھوڑ روئے زمین پر کافروں میں سے کسی کو بستا ہوا)

قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِیْمَا وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قبول کر لی گئی تمہاری دعا پس تم ثابت قدم رہو اور ہرگز نہ چلنا اس طریقہ پر جو جاہلوں کا (طریقہ) ہے"۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا ابو العالیہ نے کہا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی اور حضرت ہارون علیہ السلام نے آمین کہی، چونکہ حضرت ہارون علیہ السلام نے دعا پر آمین کہی اسی وجہ سے انہیں داعی (دعا مانگنے والا) کہا گیا اور التامین علی الدعاء کا معنی آمین کہنا ہے۔ اور تیرا قول "آمین" یہ بھی دعا ہے، یعنی اے میرے پروردگار! میرے لیے اسے قبول فرما۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر دعا بھی کی۔ اور اہل معانی نے کہا ہے: یہ اس قبیل میں سے ہے جس میں عرب واحد کو خطاب تثنیہ کے صیغے کے ساتھ خطاب کرتے ہیں، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

نقلت لصاحبی لا تُعجلانا بنزع أصوله فأجتز شیحا

یہ اس بنا پر ہے کہ آمین دعا نہ ہو اور یہ کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے دعا نہ کی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: میں نے علی بن سلیمان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: اس پر دلیل کہ دعا دونوں نے کی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ربنا ہے کیونکہ آپ نے رب (اے میرے رب) نہیں کہا۔ اور علی اور سلمی نے دعواتکما پڑھا ہے اور اس کے بعد دعوتکو نصب دی ہے۔ اور آمین کے بارے میں مکمل بحث سورۃ الفاتحہ کے آخر میں گزر چکی ہے۔ اور یہ ان چیزوں میں سے ہے جس کے ساتھ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کو خاص کیا گیا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کو تین چیزیں عطا فرمائی ہیں جو ان سے پہلے کسی کو عطا نہیں کی گئیں اسلام اور اہل جنت کا تحیہ اور سلام ہے اور ملائکہ کا صفیں بنانا اور آمین مگر یہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے پاس بھی تھی'' (1)۔ اسے حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور سورۃ الفاتحہ میں اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَاسْتَقِيْمَا فراء وغیرہ نے کہا ہے: یہ دونوں کو اپنے امر پر استقامت اختیار کرنے اور فرعون اور اس کی قوم کو ایمان کی طرف دعوت دینے کے معاملہ میں ثابت قدم رہنے کا حکم ہے یہاں تک کہ دونوں پر دعا کی قبولیت کا اثر ظاہر ہو جائے۔ محمد بن علی اور ابن جریج نے کہا ہے: فرعون اور اس کی قوم اس دعا کے قبول ہونے کے بعد چالیس برس تک باقی رہے پھر ہلاک کر دیئے گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: استقیما تم دونوں دعا پر استقامت اختیار کرو۔ اور دعا میں استقامت کا معنی حصول مقصود میں جلدی کرنے کو ترک کرنا ہے اور یہ جلدی کا مطالبہ دل سے زائل نہیں ہوتا مگر اس میں راحت اور سکون کے آنے کے ساتھ اور وہ راحت اور سکون حاصل نہیں ہو سکتا مگر اس سب کے ساتھ حسن رضامندی کے ساتھ جو غیب سے ظاہر ہوتا ہے۔ وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ یہ نون مشددہ کے ساتھ ہے اور صیغہ نہی ہونے کی وجہ سے محل جزم میں ہے اور نون تو کید ہے اور اسے التقاء ساکنین کی وجہ سے حرکت دی گئی ہے اور اس کے لیے کسرہ کو اختیار کیا گیا ہے، کیونکہ یہ نون تثنیہ کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ اور ابن ذکوان نے نفی کی بنا پر نون کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استقیما سے حال ہے ای استقیما غیر متبعین اور اس کا معنی ہے تم دونوں اس کے راستے پر نہ چلو جو میرے وعدہ اور وعید کی حقیقت کو نہیں جانتا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝

''اور ہم پار لے گئے بنی اسرائیل کو سمندر سے پھر پیچھا کیا ان کا فرعون اور اس کے لشکر نے سرکشی اور ظلم کرتے ہوئے حتیٰ کہ جب وہ ڈوبنے لگا تو (بصد یاس) کہنے لگا میں ایمان لایا کہ کوئی سچا خدا نہیں بجز اس

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 185

کے جس پر ایمان لائے تھے بنی اسرائیل اور (میں اعلان کرتا ہوں کہ) میں مسلمانوں میں سے ہوں"۔

قولہ تعالیٰ: وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ اس بارے میں بحث سورۃ البقرہ میں اس قول وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ (البقرہ:50) کے تحت گزر چکی ہے۔ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے وجوّزنا قراءت کی ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔

فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَ جُنُوْدُهٗ کہا جاتا ہے: تبع اور اتبع دونوں ایک ہی معنی میں ہیں جب کوئی پیچھے سے جا ملے اور اسے پالے اور اتّبع (تشدید کے ساتھ) جب کوئی کسی کے پیچھے چلے۔ اور اصمعی نے کہا ہے: اتبعہ (ہمزہ قطعی کے ساتھ) جب وہ اسے پیچھے سے جا ملے اور اسے پالے۔ اور اتبعہ (ہمزہ وصلی کے ساتھ ہو) جب وہ اس کے پیچھے چلے چاہے اسے پائے یا نہ پائے۔ اور اسی طرح ابو زید نے کہا ہے۔ اور قتادہ نے فَاتَّبَعَهُمْ ہمزہ وصل کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے اتبعہ (ہمزہ وصل کے ساتھ ہو) فی الامر یعنی اس نے کام میں اس کی اقتدا کی۔ اور اتبعہ (ہمزہ قطعی کے ساتھ ہو) خیرا و شرا (اور اس نے خیر یا شر میں اس کی اتباع کی) یہ ابو عمرو کا قول ہے۔ تحقیق یہ بھی کہا گیا ہے: یہ دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ نکلے اور ان کی تعداد چھ لاکھ بیس ہزار تھی اور فرعون صبح کے وقت چھبیس لاکھ کا لشکر لے کر ان کے پیچھے نکلا۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ بغیا یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ وَّ عَدْوًا یہ اس پر معطوف ہے، یعنی سرکشی اور ظلم و زیادتی کی حالت میں (نکلا)۔ کہا جاتا ہے: عدا یعدو عدوا جیسا کہ غزا یغزو غزوا ہے۔ اور حسن نے وعدوا یہ عین اور دال کے ضمہ کے ساتھ اور واؤ کی تشدید کے ساتھ ہے، جیسے علا یعلو علوا ہے۔

اور مفسرین نے کہا ہے: بغیا کا معنی ہے قول میں بغیر حق کے بلندی اور غلبے کا طالب ہونا۔ وعدوا فعل میں (غلبے کا طالب ہونا) اور یہ دونوں مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ یہاں تک کہ جب غرق نے اسے پا لیا اور اس تک پہنچ گیا (مراد یہ کہ وہ ڈوبنے لگا) قَالَ اٰمَنْتُ تو کہنے لگا میں نے تصدیق کی۔ اَنَّهٗ یعنی بأنہ، لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ پس جب حرف جار حذف کر دیا گیا تو فعل متعدی ہوا اور اس نے اسے نصب دی اور اسے کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی میں مومن ہو گیا پھر یہ نیا کلام ہے۔ اور ابو حاتم کا خیال یہ ہے کہ قول محذوف ہے، یعنی أمنت فقلت أنہ اور اس وقت کا ایمان نفع بخش ثابت نہیں ہوتا اور توبہ وہ مقبول ہوتی ہے جو عذاب دیکھنے سے پہلے ہو اور رہی وہ توبہ جو عذاب دیکھنے یا اس کے آجانے کے بعد ہو تو وہ قبول نہیں کی جاتی، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: بے شک فرعون سمندر میں داخل ہونے سے ڈر گیا وہ سیاہ رنگ کے گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے گھوڑوں میں کوئی بھی مونث گھوڑا نہ تھا، پس حضرت جبرئیل علیہ السلام ہامان کی صورت میں انتہائی شہوت والی گھوڑی پر سوار ہو کر آئے اور اسے کہا: آگے بڑھ، پھر وہ سمندر میں اتر گئے اور اس کے پیچھے فرعون کا گھوڑا بھی اتر گیا۔ اور حضرت میکائیل علیہ السلام انہیں پیچھے سے ہانکتے رہے تاکہ ان میں سے کوئی بھاگ نہ جائے۔ پس جب ان میں سے آخری آدمی سمندر میں اتر گیا اور ان کے پہلے نے باہر نکلنے کا قصد کیا تو ان پر سمندر مل گیا اور پانی فرعون کو منہ تک آ گیا تو اس نے کہا: میں اس کے ساتھ ایمان لایا جس کے ساتھ بنی اسرائیل ایمان لائے۔ تو حضرت جبرئیل علیہ

السلام نے اس کے منہ میں سمندر کی مٹی ڈال دی۔(1)

اور ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کیا تو اس نے کہا: میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس کے جس کے ساتھ بنی اسرائیل ایمان لائے حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کاش تم مجھے دیکھتے اس حال میں کہ میں سمندر کی مٹی لے رہا ہوں اور اسے اس کے منہ میں ڈال رہا ہوں اس ڈر اور خوف سے کہ رحمت اسے پالے گی''۔ ابو عیسیٰ نے کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔(2)

حال البحر سے مراد وہ سیاہ مٹی ہے جو سمندر کی تہہ میں ہوتی ہے۔ یہ اہل لغت نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ یہ ذکر کیا گیا ہے: ''حضرت جبرائیل علیہ السلام فرعون کے منہ میں مٹی دینے لگے اس ڈر اور خوف سے کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کہنے لگے اور اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرما دے یا اس خوف سے کہ وہ اس پر رحم کر دے''۔ یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے(3)۔ اور عون بن عبد اللہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا: ابلیس نے میرے نزدیک فرعون سے زیادہ مبغوض کسی کو جنم نہیں دیا، کیونکہ جب وہ ڈوبنے لگا تو اس نے کہا ''میں ایمان لایا'' الآیہ۔ تو مجھے یہ خوف لاحق ہوا کہ وہ یہ کلمہ کہے اور اس پر رحم ہو جائے، تو میں نے مٹی اٹھائی اور اسے اس کے منہ میں دبا دیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس کے ساتھ اس عمل کی سزا کے طور پر کیا گیا جو وہ انتہائی سرکشی کا عمل کر رہا ہے۔ اور کعب الاحبار نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان کے زمانے میں دریائے نیل کو چلنے سے روک لیا، تو قبطی نے اس کو کہا: اگر تو ہمارا رب ہے تو ہمارے لیے پانی جاری کر دے، پس وہ سوار ہوا اور اپنے لشکر کو آگے آگے چلنے کا حکم دیا اور وہ اپنے درجات پر ٹھہرنے لگے اور وہ وہاں بیٹھ گیا جہاں وہ اسے نہ دیکھ سکتے تھے اور اپنی سواری سے نیچے اترا اور اپنا دوسرا لباس پہنا اور سجدہ کیا اور اللہ تعالیٰ کے لیے انتہائی خشوع وخضوع اور زاری کی، پس اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے پانی جاری کر دیا، تو حضرت جبرئیل علیہ السلام اس کے پاس آئے اس حال میں کہ وہ اپنی ہی حالت پر اکیلا تھا اور اس سے فتویٰ طلب کرنے لگے: امیر اس آدمی کے بارے میں کیا کہتا ہے جس کا ایک غلام ہے اور وہ اس کے احسان اور نعمت میں ہی پروان چڑھا اور اس کے سوا اس کا کوئی سہارا نہیں، پھر اس نے اس کی نعمت کی ناشکری کی اور اس کے حق کا انکار کر دیا اور اس نے اس کے سوا کسی کے سردار ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ پس فرعون نے لکھ دیا: ابو العباس الولید بن مصعب بن ریان کہتے ہیں اس کی سزا یہ ہے کہ اسے سمندر میں غرق کر دیا جائے۔ پس حضرت جبریل علیہ السلام نے اسے لے لیا اور چلے گئے پس جب وہ ڈوبنے لگا تو حضرت جبریل علیہ السلام نے اس کا لکھا ہوا اسے دے دیا۔ یہ سورۃ البقرہ میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مسند روایت کے ساتھ گزر چکا۔ اور یہ عاشورا کا دن تھا۔ اس کا بیان بھی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ
2۔ جامع ترمذی، باب من سورۃ یونس، حدیث نمبر 3032، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ ایضاً، حدیث نمبر 3033

قولہ تعالیٰ: وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ یعنی موحدین میں سے ہوں اور طاعت و پیروی کے ساتھ تسلیم کرنے والوں میں سے ہوں۔

آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۹۱﴾

''کیا اب؟ اور تو نافرمانی کرتا رہا اس سے پہلے اور تو فتنہ و فساد برپا کرنے والوں سے تھا''۔

کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ حضرت جبریل امین علیہ السلام کا قول ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ حضرت میکائیل علیہ السلام کا قول ہے یا ان دونوں کے علاوہ کسی اور فرشتے کا قول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فرعون کا اپنی ذات کے بارے میں قول ہے۔ اور وہاں زبان کے ساتھ یہ قول نہیں ہوا بلکہ یہ اس کے دل میں واقع ہوا ہے پس اس نے اپنے دل میں کہا ہے جو کہا ہے اس حیثیت سے کہ ندامت نے اسے کوئی فائدہ نہ دیا۔ اور اس کی نظیر یہ ہے: اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (الدہر: 9) اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کی ہے اس کے سبب جو ان کے دلوں میں مخفی تھا، نہ کہ انہوں نے یہ اپنے لفظوں میں کہا اور حقیقی کلام دل کا کلام ہی ہے۔

فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً ؕ وَ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾

''سو آج ہم بچا لیں گے تیرے جسم کو (سمندر کی تند موجوں سے) تاکہ تو ہو جائے اپنے پچھلوں کے لیے (عبرت کی) نشانی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ ہماری نشانیوں سے غفلت برتنے والے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ یعنی ہم تجھے زمین کے ایک بلند حصے پر پھینک دیں گے اور یہ اس لیے کہا کیونکہ بنی اسرائیل تصدیق نہ کرتے کہ فرعون غرق ہو چکا ہے۔ اور وہ کہتے: اس کی شان اس سے کہیں زیادہ اور عظیم ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اسے زمین کے ایک بلند حصہ پر پھینک دیا یہاں تک کہ انہوں نے اس کا مشاہدہ کر لیا۔ اوس بن حجر بارش کا وصف بیان کرتا ہے۔

فَمَنْ بَعَقْوَتِهٖ كَمَنْ بِنَجْوَتِهٖ وَالْمُسْتَكِنُّ كَمَنْ يَمْشِيْ بِقِرْوَاحِ

یزیدی اور ابن السمیقع نے ننحیك حا کے ساتھ پڑھا ہے یہ تحیۃ سے ماخوذ ہے اور اسے علقمہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، یعنی تو سمندر کے کنارے پر ہوگا۔ ابن جریج نے کہا ہے: پس اسے ساحل سمندر پر پھینک دیا گیا یہاں تک کہ اسے بنی اسرائیل نے دیکھ لیا، وہ چھوٹے قد کا اور سرخ رنگ کا تھا گویا کہ وہ بیل ہے۔ علقمہ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بندائك پڑھا ہے اور یہ الندا سے ماخوذ ہے۔ ابوبکر انباری نے کہا ہے: اور یہ ہمارے مصحف کے حروف ہجا کے مخالف نہیں ہے، کیونکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اسے یا اور دال کے بعد کاف سے لکھا جائے، کیونکہ مصحف کے خط کی ترتیب میں ندائك سے الف گر جاتا ہے جیسا کہ ظلمات اور سموات سے ساقط ہو گیا ہے، پس جب اس میں حذف واقع ہوا تو بدنك اور ندائك کے حروف ہجا برابر ہو گئے، اسی بنا پر اس قراءت سے اعراض برتا گیا ہے، کیونکہ یہ شاذ ہے اور جو عام مسلمانوں کی قراءت ہے وہ اس کے خلاف ہے، قراءت سنت ہے اسے بعد میں آنے والا پہلے سے لیتا ہے اور ہماری قراءت کی تاویل کے سبب اس کے معنی میں نقص ہے، کیونکہ اس میں زرہ کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ اور وہ معنی جس کے بارے مسلسل آثار

ہیں وہ یہ ہے کہ فرعون کے غرق ہونے کے بارے بنی اسرائیل کے درمیان اختلاف ہو گیا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کی کہ وہ انہیں غرق شدہ فرعون دکھائے چنانچہ انہوں نے اسے زمین کے بلند حصہ پر اس کے بدن سمیت پالیا اور یہ اس کی وہ زرہ ہے جو وہ جنگوں میں پہنا کرتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: اس کی زرہ پروئے ہوئے موتیوں سے بنی ہوئی تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ سونے کی تھی اور وہ اسی کے سبب پہچانا جاتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ لوہے کی تھی۔ ابوالصخر نے کہا ہے: البدن سے مراد چھوٹی سی زرہ ہے۔

اور ابوعبیدہ نے اعشیٰ کا شعر بیان کیا ہے:

وبیضاء کالنِّهْیِ مَوْضُونة لها قَوْنَسٌ فوق جَیْبِ البَدَنْ

اور عمرو بن معدیکرب کا بھی شعر بیان کیا ہے:

ومضی نساءهم بکل مُفاضة جَدْلاء سابغة وبالأبدانِ

اور کعب بن مالک نے کہا ہے:

تری الأبدان فیها مسبغات علی الأبطال والیَلَب الحصِینا

اس میں ابدان سے مراد زرہیں ہیں اور یلب سے مراد یمنی زرہیں ہیں، یہ چمڑے سے بنائی جاتی تھیں اسے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ سیا جاتا تھا۔ اور یہ اسم جنس ہے اس کا واحد یلبة ہے عمرو بن کلثوم نے کہا ہے:

علینا البیضُ والیَلَبُ الیمانِی وأسیافٌ یُقَمن و یَنْحَنِینا

اور یہ بھی کہا گیا ہے: ببدنك سے مراد وہ جسم ہے جس میں روح نہ ہو۔ یہ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ اخفش نے کہا ہے: رہا ان کا قول جنہوں نے بدرعك (تیری زرہ کے ساتھ) تو یہ کوئی شے نہیں ہے۔ ابوبکر نے کہا ہے: کیونکہ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں زاری کی اور غرق شدہ فرعون کو دیکھنے کی التجا کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے لیے ظاہر کر دیا اور انہوں نے وہ جسم دیکھ لیا جس میں روح نہ تھی، پس جب بنی اسرائیل نے اسے دیکھ لیا تو کہا: ہاں، اے موسیٰ! یہ فرعون ہی ہے اور غرق کر دیا گیا ہے۔ پس ان کے دلوں سے شک نکل گیا اور سمندر نے فرعون کو نگل لیا جیسے وہ پہلے تھا۔ اس بنا پر نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے؟ ایک یہ ہے کہ ہم تجھے زمین کے بلند حصے پر پھینک دیں گے اور دوسرا یہ کہ ہم نے تیرے اس جسم کو ظاہر کر دیں گے جس میں روح نہیں۔ اور شاذ قراءت بندائك اس کا معنی جمہور کی قراءت کے معنی کی طرف ہی راجع ہے، کیونکہ ندا کی دو تفسیریں بیان کی جاتی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے ہم تجھے تیرے کلمہ توبہ کہنے کے سبب بلند جگہ پر ڈال دیں گے اور تیرے اس قول کے سبب جو اس کا دروازہ بند ہونے کے بعد اور اس کے قبول ہونے کا وقت گزر جانے کے بعد تو نے کہا: اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۝ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ آج ہم تجھے سمندر کی گہرائی سے تیری ندا کے سبب جدا کر دیں گے جو تو نے یہ کہا: أنا ربكم الأعلى پس اسے بدن سمیت نجات دینا رب العالمین کی طرف سے بطور سزا تھا اس کے اس کفر میں انتہائی غلو اور زیادتی کرنے کے سبب جس میں اس نے اللہ تعالیٰ پر افترا باندھا اور مبہوت ہو

گیا۔ اور قدرت اور ایسے امر کا دعویٰ کیا جس کے بارے وہ جانتا تھا کہ وہ اس میں جھوٹ بول رہا ہے، اس سے عاجز ہے اور اس کا مستحق نہیں ہے۔ ابوبکر انباری نے کہا ہے: پس ہماری قراءت ان معانی کو متضمن ہے جو قرأت شاذہ میں پائے جاتے ہیں بلکہ ان سے زائد کو بھی متضمن ہے۔ قولہ تعالیٰ: لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً یعنی بنی اسرائیل کے لیے اور قوم فرعون کے ان باقی ماندہ لوگوں کے لیے جو غرق نہیں ہوئے اور ان تک یہ خبر نہیں پہنچی۔

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ یعنی بہت سے لوگ ہماری آیات میں غور وفکر کرنے اور ان میں سوچ و بچار کرنے سے اعراض کرنے والے ہیں۔ اور لِمَنْ خَلْفَكَ لام کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی ان کے لیے جو تیرے بعد باقی رہیں گے اور تیری زمین میں تیرے پیچھے آئیں گے۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے لمن خلقك قاف کے ساتھ قراءت کی ہے یعنی تاکہ تو اپنے خالق کی نشانی ہو جائے۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾

”اور ہم نے عطا فرمایا بنی اسرائیل کو بہترین ٹھکانا اور ہم نے انہیں پاکیزہ رزق بخشا، پس انہوں نے اختلاف نہ کیا حتیٰ کہ آ گیا ان کے پاس حقیقت کا علم (اے حبیب!) بے شک آپ کا رب فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان روز قیامت جن باتوں میں وہ جھگڑا کیا کرتے تھے“۔

قولہ تعالیٰ: وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو پسندیدہ قابل ستائش اور بہترین ٹھکانا عطا فرمایا، مراد مصر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد اردن اور فلسطین ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: وہ مصر اور شام ہے۔ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ اور ہم نے انہیں پاکیزہ رزق یعنی پھل وغیرہ عطا فرمایا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: مراد قریظہ، نضیر اور بنی اسرائیل میں سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے لوگ ہیں، کیونکہ وہ حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لاتے تھے اور آپ کے ظہور کا انتظار کرتے تھے، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو وہ آپ کے ساتھ حسد کرنے لگے اور اسی لیے فرمایا: فَمَا اخْتَلَفُوْا پس انہوں نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے معاملہ میں اختلاف نہ کیا۔ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ یہاں تک کہ ان کے پاس قرآن کریم اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم آ گئے۔ اس میں علم بمعنی معلوم ہے۔ کیونکہ وہ آپ کو آپ کے خروج سے پہلے ہی جانتے تھے۔ یہ علامہ ابن جریر طبری نے کہا ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ یعنی آپ کا رب ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اور فرق کر دے گا۔ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ قیامت کے دن جن باتوں میں وہ دنیا میں جھگڑا کیا کرتے تھے، پس وہ طاعت کرنے والے کو ثواب دے گا اور نافرمانی کرنے والے کو سزا دے گا۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْــَٔـلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۹۵

''اور (اے سننے والے!) اگر تجھے کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے (اپنے نبی کے ذریعے) تیری طرف اتارا تو دریافت کر ان لوگوں سے جو پڑھتے ہیں کتاب تجھ سے پہلے، بے شک آیا ہے تیرے پاس حق تیرے رب کی طرف سے پس ہرگز نہ ہو جانا شک کرنے والوں سے۔ اور ہرگز نہ ہونا ان لوگوں سے جنہوں نے جھٹلایا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو ورنہ تو ہو جائے گا نقصان اٹھانے والوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کے سوا دوسرے ہیں، یعنی آپ تو شک میں نہیں ہیں لیکن آپ کے علاوہ دوسرے شک میں ہیں۔ ابو عمر محمد بن عبد الواحد الزاہد نے کہا ہے: میں نے دو اماموں ثعلب اور مبرد کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ کا معنی ہے: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کافر کو فرما دیجئے کہ اگر تو اس سے متعلق شک میں ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے۔ فَسْــَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ یعنی اے بتوں کی پوجا کرنے والے اگر تجھے قرآن کریم کے بارے میں کوئی شک ہے تو ان لوگوں سے دریافت کر لے جو یہود میں سے اسلام لا چکے ہیں، یعنی حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور انہی کی مثل دیگر افراد کیونکہ بتوں کی پرستش کرنے والے یہودیوں کے بارے میں یہ اقرار کرتے تھے کہ وہ اس بارے ان سے زیادہ عالم ہیں، کیا اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی اور رسول مبعوث فرمائے گا؟ اور قتبی نے کہا ہے: یہ خطاب ان کو ہے جو نہ یقین کے ساتھ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرتے ہیں اور نہ تصدیق کرتے ہیں، بلکہ شک میں ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: خطاب سے مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے کوئی اور نہیں اور اس کا معنی ہے: اگر آپ کو کوئی شک لاحق ہو جائے اس بارے میں جس کے متعلق ہم نے آپ کو خبر دی ہے تو آپ اہل کتاب سے دریافت کر لینا میں آپ سے شک زائل کر دوں گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: شک سے مراد سینے کی تنگی ہے، یعنی اگر آپ کا سینہ ان کے کفر کے سبب تنگ ہو جائے تو آپ صبر کیجئے۔ اور ان سے پوچھ لیں جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں وہ آپ کو بتائیں گے آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوموں کی اذیت پر کیسے صبر کیا اور ان کے معاملے کا انجام کیا ہوا؟ لغت میں شک کا اصل معنی تنگی ہے۔ کہا جاتا ہے: شك الثوب یعنی وہ اس کے سوراخوں کو بند کر دے یہاں تک کہ وہ برتن کی طرح ہو جائے۔ اور اسی طرح مسافر کا توشہ دان ہے اس کے علائق (یعنی باندھنے کے دھاگے) کو کھینچا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ بند ہو جائے، پس شک سینے کو بند کر دیتا ہے اور اسے سکیڑ دیتا ہے یہاں تک کہ وہ تنگ ہو جاتا ہے۔ اور حسین بن فضل نے کہا ہے: حروف شرط کے ساتھ فانہ فعل کو واجب کرتی ہے اور نہ اسے ثابت کرتی ہے، اور اس پر دلیل وہ روایت ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب یہ آیت نازل ہوئی: واللہ لا اشك قسم بخدا میں شک نہیں کرتا۔ پھر نیا کلام کیا اور فرمایا: لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝۹۴ یعنی شک کرنے والوں سے نہ ہو جانا۔ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۹۵ ان دونوں آیتوں میں خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے

اور مراد کوئی اور ہے۔(1)

اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَ لَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰیَةٍ حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ﴿۹۷﴾

''بے شک وہ لوگ ثابت ہو چکی ہے جن پر آپ کے رب کی بات وہ ایمان نہیں لائیں گے، اگرچہ آجائیں ان کے پاس ساری نشانیاں جب تک وہ نہ دیکھ لیں دردناک عذاب''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ اسی سورت میں اس کے بارے کلام پہلے گزر چکی ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: یعنی وہ لوگ جن پر ان کی معصیت اور گناہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا غضب اور اس کی ناراضگی ثابت ہو چکی ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ وَ لَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰیَةٍ اس میں کلا کو مونث ذکر کیا ہے اس لیے کہ اس کلام کا معنی یہ ہے۔ ولو جاءتھم الآیات (اگرچہ ان کے پاس نشانیاں آجائیں) حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ یہاں تک کہ وہ دردناک عذاب دیکھ لیں تو اس وقت وہ ایمان لائیں گے (لیکن) وہ انہیں نفع نہیں دے گا۔

فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْیَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ اِیْمَانُهَاۤ اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰی حِیْنٍ ﴿۹۸﴾

''پس کیوں ایسا نہ ہوا کہ کوئی بستی ایمان لاتی تو نفع دیتا اسے اس کا ایمان (کسی سے ایسا نہ ہوا) بجز قوم یونس کے، جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے دور کر دیا ان سے رسوائی کا عذاب دنیوی زندگی میں اور ہم نے لطف اندوز ہونے دیا انہیں ایک مدت تک''۔

قولہ تعالیٰ: فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْیَةٌ اٰمَنَتْ اخفش اور کسائی نے کہا ہے: فلولا بمعنی فھلا (پس کیوں ایسا نہ ہوا) ہے اور حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے مصحف میں فھلا ہی ہے۔ دراصل کلام میں لولا تحضیض (ابھارنے اور برانگیختہ کرنے) کے لیے آتا ہے یا غیر کے پائے جانے کی وجہ سے کسی کام سے روکنے پر دلالت کرنے کے لیے۔ اور آیت کے معنی سے بستی والوں کے ایمان کی نفی سمجھی جا رہی ہے پھر حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی استثنا کی گئی ہے، پس یہ لفظ کے اعتبار سے تو استثنا منقطع ہے، لیکن معنی کے اعتبار سے استثنا متصل ہے، کیونکہ اس کی تقدیر عبارت یہ ہے ما أمن أھل قریۃ إلا قوم یونس (یعنی بستی والوں میں سے سوائے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے کوئی ایمان نہ لایا) اور قوم کے منصوب ہونے کی یہی وجہ ہے اور اسی طرح سیبویہ نے اسے باب مالا یکون إلا منصوبا (یعنی ان کا بیان جو فقط منصوب ہوتے ہیں) میں داخل کیا ہے (2)۔ اور نحاس نے کہا ہے: اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ اسے نصب دی گئی ہے، کیونکہ یہ استثنا ہے جو اول (کلام میں) سے نہیں ہے۔ ای لکن قوم یونس (یعنی لیکن حضرت یونس علیہ السلام کی قوم ایمان لائی) یہ کسائی، اخفش اور فراء کا قول ہے۔ اور یہ بھی

1۔ بغوی، (معالم التنزیل) زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 143-144

جائز ہے کہ یہ اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ رفع کے ساتھ ہو۔ اور رفع کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سب سے احسن وہ ہے جو ابو اسحاق زجاج نے کہا ہے انہوں نے کہا ہے: اس کا معنی ہوگا غیر قوم یونس، پس جب کلام اِلَّا کے ساتھ آیا تو اس کے مابعد اسم کو غیر کا اعراب دے دیا گیا، جیسا کہ کسی شاعر نے بھی کہا ہے:

وَكُلُّ أَخٍ مُفَارِقُهُ أَخُوهُ لَعَمْرُ أَبِيكَ إِلَّا الْفَرْقَدَانِ

(اس میں اِلَّا بمعنی غیر ہے)

مفسرین کی ایک جماعت سے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے قصہ میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم موصل کی سرزمین میں نینویٰ کے مقام پر آباد تھی اور وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کو ان کی طرف بھیجا اور آپ انہیں اسلام کی طرف اور جن نظریات پر وہ تھے انہیں ترک کرنے کی دعوت دینے لگے لیکن انہوں نے انکار کیا۔ پس کہا گیا ہے کہ بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں نو سال تک دعوت دیتے رہے بالآخر آپ ان کے ایمان سے مایوس اور ناامید ہو گئے۔ تو آپ کو کہا گیا: آپ انہیں اطلاع کریں کہ تین دن تک ان پر عذاب آنے والا ہے چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور وہ کہنے لگے: یہ آدمی جھوٹ نہیں بولتا ہے پس تم اس کی تاک میں رہو پس اگر یہ تمہارے ساتھ اور تمہارے درمیان مقیم رہے تو پھر تم پر کچھ بھی نہیں آئے گا اور اگر یہ تم سے کوچ کر جائے (نکل جائے) تو بلاشک وہی عذاب کے نازل ہونے کا وقت ہوگا۔ پس جب رات آئی تو حضرت یونس علیہ السلام نے زاد راہ لیا اور ان سے نکل گئے پس جب انہوں نے صبح کی تو آپ کو نہ پایا تو وہ توبہ کرنے لگے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے لگے اور انہوں نے ٹاٹ پہن لیے اور انسانوں اور جانوروں میں سے ماؤں اور بچوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا اور اس حالت میں انہوں نے مظالم چھوڑ دیئے۔ (1)

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ایک آدمی پتھر لا رہا تھا اور اس پر اپنی عمارت کی بنیاد رکھتا تو وہ اسے اکھیڑنے لگا اور اسے رد کرنے لگا۔ جو کچھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے اس کے مطابق عذاب ان سے ایک میل کے دو تہائی فاصلے پر تھا۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ وہ ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہیں بادل نے ڈھانپ لیا اور اس میں سرخی تھی پس وہ مسلسل قریب آ رہا تھی کہ وہ اس کی گرمی اپنے کندھوں کے درمیان پانے لگے۔ اور حضرت ابن جبیر نے بیان کیا ہے: عذاب نے انہیں اس طرح ڈھانپ لیا جیسے کپڑا قبر کو ڈھانپ لیتا ہے، پس جب انہوں نے صحیح توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان سے عذاب اٹھا لیا۔ اور علامہ طبری رحمہ اللہ نے کہا ہے: تمام امتوں میں سے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا یہ خاصا ہے کہ عذاب کا معائنہ کر لینے کے بعد ان پر رحمت کی توجہ کی گئی اور ان کی توبہ قبول کر لی گئی۔ اور انہوں نے اسے مفسرین کی ایک جماعت سے ذکر کیا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: بے شک ابھی ان پر عذاب واقع نہیں ہوا تھا، بلکہ انہوں نے فقط اس علامت اور نشانی کو دیکھا تھا جو عذاب پر دلالت کرتی ہے اور اگر وہ عین عذاب کو دیکھ لیتے تو پھر ایمان انہیں کوئی فائدہ نہ دیتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: زجاج کا قول اچھا ہے، کیونکہ وہ مشاہدہ جس کے ساتھ توبہ نفع بخش نہیں ہوتی وہ عذاب کے ساتھ

1۔ تفسیر الطبری، المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

ملتبس ہونا اور اس میں واقع ہو جانا ہے جیسا کہ فرعون کا واقعہ ہے۔ اور اسی لیے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا واقعہ فرعون کے قصہ کے پیچھے ذکر ہوا کیونکہ وہ اس وقت ایمان لایا جب اس نے عذاب دیکھ لیا پس وہ اس کے لیے نفع بخش ثابت نہ ہوا اور حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے اس سے پہلے توبہ کر لی۔ اور اسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد بھی تقویت دیتا ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے جب تک غرغر کی آواز نہ نکلے''۔ اور الغرغرۃ کا معنی ہے جان کنی کے وقت سانس کا غرغرانا۔ اور یہ موت کے ساتھ ملنے کی حالت ہوتی ہے۔ اور اس سے پہلے اس طرح نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم

اور جو معنی ہم نے بیان کیا ہے وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے جب ان سے تین دن تک عذاب آنے کا وعدہ کیا اور آپ ان سے نکل گئے پس جب انہوں نے صبح کی اور آپ کو نہ پایا تو وہ توبہ کرنے لگے اور انہوں نے ماؤں کو اپنے بچوں سے علیحدہ کر دیا (1)۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کی توبہ عذاب کی علامت دیکھنے سے پہلے ہوئی۔ عنقریب سورۂ والصافات میں اس کا واضح اور کھلا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ

اور كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ کا معنی ہوگا یعنی ہم نے ان سے وہ عذاب دور کر دیا جس کے بارے حضرت یونس علیہ السلام نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان پر نازل ہوگا، نہ یہ کہ انہوں نے اسے آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور نہ یہ کہ انہیں اس کا خیال تھا۔ اس بنا پر اس میں نہ کوئی اشکال ہے، نہ تعارض اور نہ ہی کوئی خصوصیت ہے واللہ اعلم۔ المختصر یہ کہ نینویٰ کے باسی اللہ تعالیٰ کے علم سابق میں سعادت مند تھے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: بے شک خوف اور ڈر تقدیر کو رد نہیں کرتا، بلکہ دعا تقدیر کو رد کر دیتی ہے، یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۭ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ عاشوراء کا دن تھا (یعنی دسویں محرم)

قولہ تعالیٰ: وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ کہا گیا ہے: اور ہم نے انہیں ان کی مقررہ مدت تک لطف اندوز ہونے دیا۔ یہ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور یہ قول بھی ہے: اور ہم نے انہیں لطف اندوز ہونے دیا اس وقت تک کہ وہ جنت کی طرف چلے جائیں یا جہنم کی طرف۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾

''اور اگر چاہتا آپ کا رب تو ایمان لے آتے جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کے سب، کیا آپ مجبور کرنا چاہتے ہیں لوگوں کو یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا یعنی وہ ان تمام کو ایمان لانے پر مجبور کر دیتا۔ كُلُّهُمْ، من کی تاکید ہے اور جَمِيْعًا سیبویہ کے نزدیک حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے کہ جمعیا کا لفظ بھی کل کے بعد تاکید کے لیے آیا ہے، جیسا کہ یہ قول باری تعالیٰ ہے: لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ (النحل: 51) (یعنی اس میں اثنین الھین کی تاکید کے لیے ہے) قولہ تعالیٰ: اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

1۔ تفسیر الطبری، جلد 12، صفحہ 296

حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں کے ایمان لانے کے حریص تھے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبر دی کہ کوئی ایمان نہیں لا سکتا مگر وہی جو ذکر اول میں پہلے سعادت مند ہو اور کوئی گمراہ نہیں ہو سکتا مگر وہی جو ذکر اول میں پہلے شقی ہو (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الناس سے مراد ابو طالب ہیں۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝

''اور کوئی بھی ایسا شخص نہیں کہ وہ ایمان لا سکے بغیر حکم الٰہی کے۔ اور (سنت الٰہی یہ ہے کہ) وہ ڈالتا ہے (گمراہی کی) آلودگی ان لوگوں پر جو بے سمجھ ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ اس میں ما نافیہ ہے، یعنی یہ مناسب نہیں کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر اور اس کی مشیت و ارادہ کے بغیر ایمان لا سکے۔ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ حسن، ابوبکر اور مفضل نے ونجعل تعظیم کے لیے نون کے ساتھ پڑھا ہے اور الرجس کا معنی عذاب ہے۔ را کے ضمہ اور اس کے کسرہ کے ساتھ اس کی دو لغتیں ہیں۔ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ یعنی ان لوگوں پر جو اللہ تعالیٰ کے امر و نہی کو نہیں سمجھتے۔ (2)

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝

''فرمایئے غور سے دیکھو! کیا کیا (عجائبات) ہیں آسمانوں اور زمین میں اور فائدہ نہیں پہنچاتیں آیتیں اور ڈرانے والے اس قوم کو جو ایمان نہیں لانا چاہتے''۔

قولہ تعالیٰ: قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ کفار کے لیے ان مصنوعات میں غور و فکر اور تدبر کرنے کے بارے امر ہے جو صانع پر اور اس کے کمال قدرت پر دلالت کرتی ہیں۔ اس بارے میں مکمل بحث کئی مقامات پر پہلے گزر چکی ہے۔ وَمَا تُغْنِي یہ ما نافیہ ہے ای ولن تغنی (یعنی آیتیں ہرگز فائدہ نہیں پہنچائیں گی) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ما استفہامیہ ہے اور تقدیر کلام ہے ای شی تغنی (کون سی شے کا نفع آیات پہنچا سکتی ہیں)

الْاٰيٰتُ مراد دلالات اور نشانیاں ہیں۔ وَالنُّذُرُ یعنی رسل علیہم السلام اور یہ نذیر کی جمع ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ یعنی اس قوم کو جن کے بارے پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝

''پس وہ انتظار نہیں کر رہے مگر ان لوگوں جیسے حالات کا جو گزر چکے ہیں ان سے پہلے، آپ فرمایئے اچھا انتظار کرو بے شک میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں سے ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ یہاں ایام سے مراد واقعات ہیں یعنی بمعنی وقائع

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 298 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 370

ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان عالم بایام العرب یعنی فلاں عرب میں پیش آنے والے واقعات کا عالم ہے۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: مراد وہ واقعات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے قوم نوح، عاد اور ثمود وغیرہ میں پیش آئے۔ اور عرب عذاب اور انعام دونوں کو ایام کا نام دیتے ہیں، جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے: وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ (ابراہیم: 5) اور ہم وہ جو خیر و شر میں سے گزر چکا ہے وہی ایام ہے۔ فَانْتَظِرُوْٓا یعنی تم انتظار کرو یہ تہدید (ڈانٹ ڈپٹ) اور وعید ہے۔ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ بے شک میں بھی تمہارے ساتھ اپنے رب کے وعدہ کا انتظار کرنے والوں سے ہوں۔

ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

''(جب وہ عذاب آجائے گا) پھر ہم بچالیں گے اپنے رسولوں کو اور انہیں جو ایمان لائے بلاشبہ ایسا ہی ہوگا، یہ ہمارے ذمہ ہے کہ ہم بچالیں گے اہل ایمان کو''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی ہماری سنت میں سے ہے کہ جب ہم کسی قوم پر عذاب نازل کریں تو ان کے درمیان سے اپنے رسولوں اور اہل ایمان کو نکال لیتے ہیں۔ اور ثُمَّ اس کا معنی ہے ثم اعلموا انا ننجی رسلنا (پھر تم جان لو کہ ہم اپنے رسولوں کو بچالیں گے)

كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا یعنی ہم پر واجب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے اور اس کی خبر میں خلاف نہیں ہو سکتا۔ اور یعقوب نے ثُمَّ نُنَجِّيْ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور کسائی، حفص اور یعقوب نے ننجی المؤمنین کو مخفف پڑھا ہے اور باقیوں نے مشدد پڑھا ہے۔ اور یہ دونوں لغتیں فصیح ہیں۔ انجی ینجی انجاء اور نجی ینجی تنجیۃ دونوں کا معنی ایک ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

''فرمائیے اے لوگو! اگر تمہیں کچھ شک ہو میرے دین کے بارے میں تو (سن لو) میں عبادت نہیں کرتا ان (بتوں) کی جن کی تم پوجا کیا کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا، لیکن میں تو عبادت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کی جو مارتا ہے تمہیں۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ہو جاؤں اہل ایمان سے''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ مراد کفار مکہ ہیں۔ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ اگر تمہیں اس دین اسلام کے بارے میں کوئی شک ہو جس کی طرف میں تمہیں بلاتا ہوں۔ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ تو (سن لو) میں ان بتوں کی عبادت نہیں کرتا جو عقل اور سمجھ نہیں رکھتے جن کی تم پوجا کرتے ہو اللہ کے سوا۔ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ لیکن میں تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہیں مارتا ہے اور تمہاری ارواح قبض کرتا ہے۔ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان اہل ایمان سے ہو جاؤں جو اپنے رب کی آیات کی تصدیق کرتے ہیں۔ (1)

وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ وَلَا تَدْعُ مِنْ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 203

دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكَ وَ لَا یَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰۶﴾

"نیز (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ) اپنا رخ سیدھا کر لے اس دین کی طرف ہر کجی سے بچتے ہوئے اور ہرگز نہ ہو جانا شرک کرنے والوں سے۔ اور نہ عبادت کر اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی جو نہ نفع پہنچا سکتا ہے تجھے اور نہ ضرر پہنچا سکتا ہے تجھے۔ اور اگر تو ایسا کرے گا تو پھر تیرا شمار ظالموں میں ہوگا"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ، أن کا عطف ان اکون پر ہے یعنی مجھے کہا گیا ہے کہ مومنین سے ہو جا اور اپنا رخ سیدھا کر لے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اور اپنا عمل سیدھا کر لے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اپنا آپ سیدھا کر لے، یعنی اپنی توجہ اس پر مرکوز کر لے دین میں سے جس بارے آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ حَنِیْفًا یعنی ہر دین سے بچتے ہوئے سیدھا اس کی طرف کر لے (جس کا حکم دیا گیا ہے) حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

حمدتُ الله حین هدی فؤادی من الإشراك الدین الحنیف

میں نے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی جس وقت اس نے میرے دل کو شرک سے خالص دین کی طرف ہدایت عطا فرمائی۔

اس کے مادہ اشتقاق کا ذکر سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے والحمد للہ۔ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ یعنی اور مجھے کہا گیا ہے: تو شرک نہ کر۔ یہ خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد غیر ہے۔ اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَ لَا تَدْعُ یعنی تو عبادت نہ کر۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكَ اگر تو نے اس کی عبادت کی (تو وہ تجھے کوئی نفع نہ دے گا) وَ لَا یَضُرُّكَ اگر تو نے اس کی نافرمانی کی (تو تجھے ضرر نہ دے سکے گا) فَاِنْ فَعَلْتَ یعنی اگر تو نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت کی۔ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ تو بے شک تو عبادت کو تو اس کے غیر محل میں رکھنے والا ہو جائے گا۔ (1)

وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ یُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۰۷﴾

"اور اگر پہنچائے تجھے اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف تو نہیں کوئی دور کرنے والا اسے بجز اس کے۔ اور اگر ارادہ فرمائے تیرے لیے کسی بھلائی کا تو کوئی رد کرنے والا نہیں اس کے فضل کو، سرفراز فرماتا ہے اپنے فضل و کرم سے جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور وہی بہت مغفرت فرمانے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ یعنی اگر تجھے اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف پہنچائے۔ فَلَا كَاشِفَ یعنی کوئی دور کرنے والا نہیں۔ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ اس کو بجز اس کے اور اگر وہ تجھے آسودگی اور نعمت پہنچائے۔ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ یُصِیْبُ بِهٖ تو کوئی رد کرنے والا نہیں ہر اس کو جس کا خیر و شر میں سے وہ ارادہ فرمائے۔ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ اور وہی اپنے بندوں کے گناہوں اور ان کی خطاؤں کو بخشنے والا ہے الرَّحِیْمُ اور آخرت میں اپنے اولیاء کے ساتھ رحم فرمانے والا ہے۔ (2)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 371 2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 305

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا ۚ وَ مَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ ﴿۱۰۸﴾

''(اے حبیب!) فرمایئے اے لوگو! بے شک آ گیا ہے تمہارے پاس حق تمہارے رب کی طرف سے، تو جو ہدایت قبول کرتا ہے تو وہ ہدایت قبول کرتا ہے اپنے بھلے کے لیے اور جو گمراہ ہوتا ہے تو وہ گمراہ ہوتا ہے اپنی تباہی کے لیے اور میں تم پر نگران نہیں ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ اس میں حق سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى یعنی جس نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی اور اس (دین) کے ساتھ ایمان لایا جو آپ لے کر آئے۔ فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ وہ اپنے نفس کی نجات اور خلاصی کے لیے ہدایت قبول کرتا ہے۔

وَ مَنْ ضَلَّ جس نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کو چھوڑ دیا اور بتوں کی پیروی اور اتباع کی۔ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا تو بلا شبہ اس کا وبال اسی پر پڑے گا۔ وَ مَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ یعنی میں تم پر محافظ و نگران نہیں ہوں کہ تمہارے اعمال کی نگرانی کروں بلا شبہ میں تو رسول اور پیغامبر ہوں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: آیۃ السیف نے اس آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔

وَ اتَّبِعْ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ وَ اصْبِرْ حَتّٰى یَحْكُمَ اللّٰهُ ۖۚ وَ هُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾

''اور (اے حبیب!) آپ پیروی کرتے رہیں جو وحی کی جاتی ہے آپ کی طرف اور (ظلم کفار پر) صبر کیجئے یہاں تک فیصلہ فرما دے الله، اور وہ سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اتَّبِعْ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ وَ اصْبِرْ کہا گیا ہے: یہ آیت قتال کے ساتھ منسوخ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے اور اس کا معنی ہے اطاعت کرنے پر اور معصیت سے بچنے پر صبر کیجئے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو جمع کیا اور آپ نے ان کے ساتھ کسی غیر کو جمع نہ کیا اور فرمایا: ''بے شک تم میرے بعد بلا استحقاق دوسروں کی فضیلت اور ترجیح کو پاؤ گے پس تم صبر کرنا یہاں تک کہ تم مجھے حوض پر آملو''۔ إنكم ستجدون بعدی أثرة فاصبروا حتى تلقونی على الحوض (2) اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت ہے، پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پس انہوں نے صبر نہ کیا تو آپ نے انہیں صبر کرنے کا حکم دیا جیسے الله تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا۔ اس بارے میں عبدالرحمٰن بن حسان کہتے ہیں:

ألا أبلغ معاوية بن حرب　　أمير المومنين نثا كلامی
بأنا صابرون و منظروكم　　إلى يوم التغابن والخصام

حَتّٰى یَحْكُمَ اللّٰهُ ۖۚ وَ هُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ یہ مبتدا اور خبر ہیں، کیونکہ الله تعالیٰ سوائے حق کے کوئی فیصلہ نہیں فرماتا۔

تمت ترجمہ سورۂ یونس

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الطائف، حدیث نمبر 3986، ضیاء القرآن پبلی کیشنز